سُلطان نے زین پر بیٹھتے ہی گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔تھوڑی دیر بعد وہ شگاف کے قریب پہنچ تو انور علی نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا اور گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔عالی جاہ آگے مت جائیے۔

سُلطان نے کہا۔کیوں کیا بات ہے تم اس قدر بدحواس کیوں ہو؟

انور علی کی طرف سے کسی جواب سے قبل یکے بعد دیگرے توپ کے تین گولے چند قدم دور گرے اور لوہے کا ایک ٹکڑا سُلطان کا بازو چھوتا ہوا نکل گیا۔ بائیں طرف فوج کے افسروں اور سپاہیوں کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔تین آدمی سُلطان کو دیکھتے ہی بھاگتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ان میں سے ایک بدرالزمان دوسرا میر صادق اور تیسرا یورپین دستوں کا افسر اعلیٰ موسیو چیوئے تھا۔ان کے نزدیک آنے تک شگاف کے قرب چند اور گولے گرے۔سُلطان اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔بدرالزمان خان، میر صادق اور فرانسیسی افسر سلام کرنے کے بعد ادب سے سلطان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور فرانسیسی افسر نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔حضور میں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

کہو!

عالی جان آپ کے جاں نثاروں کے لیے یہ صورت حال بہت پریشان کن ہے۔اب مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ہماری فوج میں کوئی ایسے غدار ضرور ہیں جو ہمارے مورچوں کے اندر بیٹھ کر دشمن کی رہنمائی کر رہے ہیں۔یہ قلعے کا سب سے کمزور حصہ ہے اور اس پر مسلسل گولہ باری اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ دشمن سے ہماری کوئی کمزوری پوشیدہ نہیں۔دشمن چاروں طرف اپنے مورو چے اتنے قریب لا چکا ہے کہ وہ کسی وقت بھی سرنگا پٹم پر یلغار کر سکتا ہے۔

ہمارے لیے جنگ کو موسمِ برسات تک طول دینا زندگی اور موت کا مسئلہ ہے لیکن بعض انتہائی ذمہ دار افسروں کے سابقہ کردار کے پیشِ نظر مجھے یہ توقع نہیں کہ ہم زیادہ دیر دشمن کو سرنگا پٹم کی دیواروں سے باہر روک سکیں گے۔ اگر مجھے بزدل یا نمک حرام نہ سمجھا جائے تو میں کہو تم رُک کیوں گئے۔ اگر تم کوئی مفید تجویز پیش کر سکتے ہو تو ہم سُننے کے لیے تیار ہیں۔

عالی جاہ! میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ سرنگا پٹم کی بجائے سرائے چتل ڈرگ کو اپنا مستقر بنا کر دشمن کے ساتھ جنگ جاری رکھیں۔ اگر آپ دس ہزار سوار اور پانچ ہزار پیادہ سپاہی اپنے ساتھ لے جائیں تو بھی سرنگا پٹم کی دفاعی قوت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوگی۔ سرنگا پٹم کو اگر کوئی خطرہ ہے تو وہ ان غداروں کی طرف سے ہے جن کی سازشوں کے باعث ابھی حضور کے وفادار سپاہوں کو اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا۔ اگر آپ میری تجویز مانیں تو میں آخری دم تک سرنگا پٹم کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔

میر صادق نے بدرالزمان کی طرف دیکھا اور اس نے کہا۔ عالی جاہ موسیو چیپوئے اور ان کے ساتھیوں کے خلوص اور وفاداری کا مجھے اعتراف ہے لیکن حضور کے سرنگا پٹم سے چلے جانے کے بعد ہمارے سپاہیوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں گے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ سرنگا پٹم میں کوئی سازش ہو رہی ہے۔ لیکن ہم میں اگر کوئی نمک حرام موجود ہے تو بھی حضور کو یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔ ورنہ ان کے حوصلے بہت بلند ہو جائیں گے۔

میر صادق نے کہا۔ عالی جاہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ڈھال اور تلوار صرف آپ کی ذات ہے۔ ہمارے پاس، ہماری توپیں اور بندوقیں یا ہماری

فصیلیں اور خندقیں آپ کی جگہ نہیں لے سکتیں۔

فرانسیسی افسر نے مایوس ہو کر کہا۔ عالی جاہ اگر حضور کو میری یہ تجویز منظور نہ ہو تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انگریزوں کو حضور کے خلاف سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ ہم فرانسیسی جنہیں وہ اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں آپ کی فوج میں ملازم ہیں۔ اگر ہماری قربانی دے کر آپ دشمن کے ساتھ مصالحت کر سکیں تو میسور کی خاطر میرے تمام ساتھی انگریزوں کی قید میں جانے کے لیے تیار ہیں۔

نہیں سلطان ٹیپو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ان شریف اور بہادر، وفادار ساتھیوں کو دشمن کے حوالے نہیں کر سکتا۔ جو میری دعوت پر اپنا وطن چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ یہ بات میسور کے ایک معمولی سپاہی کے لیے بھی ناقابلِ برداشت ہوگی۔

سُلطان گھوڑے پر سوار ہو کر سپاہیوں کے ہجوم کی طرف بڑھا اور وہ صف بستہ کھڑے ہو گئے۔ سلطان نے ان کے قریب پہنچ کر کہا۔ تم نے اس شگاف کی مرمت کیوں نہیں کی؟

ایک افسر نے جواب دیا۔ عالی جاہ ہم نے پچھلے پہر سید غفار کے حکم سے اس کی مرمت شروع کر دی تھی لیکن میر صاحب کا خیال تھا کہ ہمیں دشمن کی گولہ باری تھم جانے کا انتظار کرنا چاہیے۔

کون سے میر صاحب؟ سلطان نے غصے کے لہجے میں سوال کیا۔

دیوان صاحب عالی جاہ!

سلطان نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اتنی دیر میں میر صادق اور اس کے ساتھی قریب پہنچ چکے تھے۔ سلطان نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑتے ہوئے میر صادق سے

کہا۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس شگاف اور دشمن کی خندقوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں۔ اس کے باوجود تم نے انہیں شگاف بند کرنے سے منع کیا ہے؟

عالی جاہ! دشمن کی گولہ باری بہت شدید تھی اور میں نے اپنے سپاہیوں کی جانیں بلاوجہ خطرے میں ڈالنا مناسب خیال نہ کیا۔

سلطان نے کہا۔ چند جانوں کے لیے پورے میسور کی عزت اور آزادی خطرے میں نہیں ڈالی جاسکتی۔ میں حکم دیتا ہوں کہ یہ شگاگ کسی تاخیر کے بغیر بند کر دیا جائے اور باقی افسروں کو حکم دو کہ وہ اپنے اپنے موروچوں میں چلے جائیں۔

بہت اچھا عالی جاہ!

اس کے بعد سلطان نے مشرق کی طرف باگ موڑی اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ قریباً تین گھنٹے شہر کے تمام مورچوں کا معائنہ کرنے، افسروں اور سپاہیوں کو ضروری ہدایات دینے اور رات کی لڑائی میں زخمی ہونے والے سپاہیوں کو دیکھنے کے بعد وہ اپنے محل کا رُخ کر رہا تھا۔



دوپہر کے وقت شمالی فصیل کے وسطی حصے پر سخت گولہ باری ہو رہی تھی۔ سید غفار اپنے چند افسروں کے ہمراہ شہر کے مختلف حصوں میں گشت کرتا ہوا وہاں پہنچا اور گھوڑے سے کود کر بھاگتا ہوا ایک بُرج کی طرف بڑھا۔ دائیں طرف سے کسی کی آواز آئی۔ فوجدار صاحب ٹھہریں۔

سید غفار رُک گئے اور سرنگا پٹم کے قید خانے کے داروغہ نے آگے بڑھ کر کہا۔ میں بڑی دیر سے آپ کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔ میں نے جنوبی دروازے کے قریب بھی آپ کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن آپ میری طرف توجہ دیے بغیر

آگے نکل گئے تھے۔ آپ سے پہلے میں سلطان معظم کی خدمت میں حاضر ہونے کی کوشش کر چکا ہوں لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔

پاس ہی فصیل پر ایک گولہ پھٹا اور اینٹوں کے کئی ٹکڑے ادھر اُدھر گر پڑے سید غفار نے کہا۔ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو جلدی کہو میرا وقت ضائع مت کرو۔

داروغہ نے کہا۔ جناب قلعے کے جنوب مغربی کونے میں جو بڑا شگاف پیدا ہو چکا ہے آپ کو اس کی طرف فوری توجہ دینی چاہیے۔

تم کو شگاف کے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ آج شام تک وہ بند کر دیا جائے گا۔ اور میں نے وہاں کافی سپاہی بھیج دیے ہیں۔ میر صادق وہاں موجود ہیں۔ اگر تم کوئی بہتر مشورہ دے سکتے ہو تو ان کے پاس چلے جاؤ۔

سید غفار یہ کہہ کر تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگا اور آن کی آن میں برج پر جا پہنچا۔ بُرج کے اندر تین توپیں نصب تھیں اور انور علی دوربین کی مدد سے دریا کے پار دشمن کی نقل وحرکت کا جائزہ لینے کے بعد توپچیوں کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ سید غفار آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے دوربین پکڑ لی اور آنکھ سے لگاتے ہوئے کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج دشمن اپنی توپوں کو آگے لے آیا ہے لیکن دریا کے کنارے ان کی خندقوں میں مکمل سکوت ہے۔

انور علی نے کہا۔ فصیل کے مشرقی حصے کے سامنے ہم نے دشمن کے بیشتر توپ خانوں کو پیچھے ہٹا دیا ہے۔ سید غفار نے دوربین نیچے کرتے ہوئے کہا۔ مجھے پانی دو۔

ایک سپاہی نے اپنی چھاگل اتار کر پیش کر دی اور پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد سید غفار کے تھکے اور مرجھائے ہوئے چہرے پر قدرے تازگی آ گئی۔ قید خانے کا

داروغہ سیڑھیوں سے نمودار ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ جناب میں آپ سے ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔

سید غفار نے برہم ہو کر کہا۔ میں نے تمہیں میر صادق کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا۔ جناب اگر میں میر صادق سے کوئی بات کر سکتا تو مجھے تمام شہر میں آپ کو تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر میر صادق کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس وقت میں آپ کے پاس کھڑا ہوں تو وہ مجھے بات کرنے کا موقع نہیں دے گا۔

تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

جناب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گزشتہ رات پچھلے پہر ایک انگریز افسر بڑے شگاف کا معائنہ کرنے کے لیے آیا تھا اور میر صادق نے شگاف سے باہر نکل کر اس کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کی تھیں۔

سید غفار پر ایک ثانیہ کے لیے سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر اس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ تمہیں معلوم ہے کہ موجودہ حالات میں ایسی خطرناک افواہیں پھیلانے والوں کی سزا موت ہے؟

مجھے معلوم ہے جناب۔ لیکن یہ افواہ نہیں۔ جب میر صادق جنرل ہیرس کے جاسوس سے سرنگا پٹم کا سودا چکا رہا تھا تو وہاں چند افسر موجود تھے اور ان میں سے ایک میرا بیٹا تھا۔

تمہارا بیٹا! سید غفار اور انور علی نے یک زبان ہو کر کہا۔

انور علی اور سید غفار کی طرح توپ خانے کے سپاہی بھی حیرانی اور اضطراب کی حالت میں داروغہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سید غفار نے ان میں سے ایک افسر کے ہاتھ میں دُوربین دیتے ہوئے کہا۔ تم اپنا کام جاری رکھو!

انور علی نے داروغہ سے مُخاطب ہو کر کہا۔ آپ کے بیٹے کا نام سلیمان ہے؟

جی ہاں!

وہ یہ گواہی دے گا؟

جی نہیں۔ وہ مر چکا ہے۔ آج نو بجے کے قریب اسے زخمی حالت میں میرے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرتے وقت اس نے یہ درخواست کی تھی کہ میں سُلطان کے پاس جا کر اس کے اور اپنے جرم کا اقبال کر لوں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ انگریز آج پورے ایک بجے اس شگاف کی طرف سے حملہ کریں گے۔ آپ میر صادق کی غداری پر یقین نہیں کریں گے لیکن میرے پاس اس کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ آپ ملک جہان خاں کو جانتے ہیں وہ اس وقت سرنگا پٹم کے قید خانے کی ایک زمین دوز کوٹھڑی میں پڑا ہوا ہے۔ میں نے میر صادق، میر قمر الدین، پورنیا اور معین الدین کے حکم پر اسے قید خانے میں رکھا تھا۔ انہوں نے مجھے اس جرم پر آمادہ کرنے کے لیے ایک معقول رقم دی تھی اور اس کے ساتھ ہی یہ دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے یہ راز ظاہر کر دیا تو مجھے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔

پچھلے دنوں میں اپنے ضمیر کی علامت سے مجبور ہو کر غازی خاں کے پاس اپنا آدمی بھیجا تھا اور انہیں اس واقعے کی اطلاع دینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ قید خانے کے راستے میں قتل کر دیے گئے اور میرا آدمی جوان کے ساتھ آ رہا تھا ان پر حملہ کے وقت بھاگ آیا تھا۔ قاتلوں کے متعلق مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون تھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ قتل بھی انہی غداروں کی سازش کا نتیجہ تھا جو غازی بابا کا زندہ رہنا اپنے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ غازی خاں کے قتل کے بعد میں نے اپنا مستقبل پھر انہی لوگوں کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ انہوں نے میرے بیٹے کو انگریزوں سے بہت بڑی جاگیر

دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔اب مجھے نہ تو اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ موت کا ڈر ہے۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ یہ انکشاف اب آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔میرے بیٹے نے مرتے وقت یہ بتایا تھا کہ دشمن دو پہر کے وقت ایک بجے عام حملہ کر دے گا۔

ایک بجے۔سید غفار نے جلدی سے اپنی جیب سے گھڑی نکالتے ہوئے کہا۔ اور ایک بجنے میں صرف دس منٹ باقی ہیں۔تم نے ہمارا اتنا وقت ضائع کر دیا۔

سید غفار اور انور علی بھاگتے ہوئے فصیل سے نیچے اترے۔سوار ابھی تک سیڑھیوں کے سامنے کھڑے تھے سید غفار نے اپنے گھوڑے کی زین پر کودتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔تم فوراً افسروں کو میرا یہ حکم پہنچا دو کہ وہ اپنے تمام فالتو دستے جنوب مغرب کی طرف بڑے شگاف کی حفاظت کے لیے بھیج دیں۔ دُشمن اس طرف سے حملہ کر رہا ہے۔

سید غفار نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور انور علی اس کے پیچھے ہو لیا۔باقی سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے ادھر ادھر نکل گئے۔چند منٹ بعد سید غفار اور انور علی شگاف کے قریب پہنچ چکے تھے لیکن یہ دیکھ کر سید غفار کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جس جگہ کچھ دیر قبل سلطان کے حکم سے دو ہزار سپاہی متعین کیے گئے تھے۔وہاں صرف پندرہ بیس آدمی کھڑے تھے۔آس پاس فصیل کے مورچوں پر بھی سپاہیوں کی تعداد بہت کم معلوم ہوتی تھی۔سید غفار سپاہیوں کے قریب گھوڑا روکتے ہوئے چلایا۔باقی آدمی کہاں ہیں؟

ایک سپاہی نے جواب دیا۔جناب وہ خزانے سے تنخواہیں وصول کرنے گئے ہیں۔

کس کی اجازت سے

جناب دیوان صاحب میر صادق نے حکم دیا تھا۔

سید غفار اور انور علی گھوڑے سے کود کر بھاگتے ہوئے شگاف سے تھوڑی دور ایک سیڑھی کے راستے فصیل پر چڑھے اور دریا کے پار دشمن کی خندقوں کی طرف دیکھنے لگے۔ وہاں کسی نقل و حرکت کے آثار نہ پا کر سید غار نے قدرے مطمئن ہو کر انور علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ مجھے داروغہ کے بیان پر یقین نہیں آتا۔ اب ایک بج چکا ہے۔

ادھر دیکھیے۔ انور علی نے جلدی سے ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سید غفار نے آنکھیں پھاڑ کر جنوب مشرق کی طرف دیکھا تو ہزاروں انگریز خندقوں اور مورچوں سے نکل کر بے تحاشا فصیل کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک افسر فصیل پر بھاگتا ہوا آیا اور دور سے ہی سید غفار کو پہنچا کر چلانے لگا۔ جناب دشمن شمال مشرق کے مورچوں سے نکل کر دریا عبور کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

سید غفار نے انور علی سے کہا۔ انور تم فوراً سلطان کی خدمت میں پہنچنے کی کوشش کرو اور انہیں اس بات پر آمادہ کرو کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر سرنگا پٹم سے نکلنے کی کوشش کریں۔ اب دشمن کے ساتھ جنگ جاری رکھنے کی آخری صورت یہی ہے کہ وہ چتل ڈرگ پہنچ جائیں۔ انور بھاگتا ہوا فصیل سے نیچے اترا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

☆

خندقوں سے قریباً سو گز آگے حملہ آور فوج کے راستے میں دریا حائل تھا اور دریا کا پاٹ تین سو گز کے قریب تھا۔ موسم گرما کے آغاز سے اب تک بارش کی کمی کے باعث پانی کی گہرائی کسی جگہ ٹخنے اور کسی جگہ کمر کے برابر تھی۔ دریا سے آگے کوئی ساٹھ گز چوڑی خندق تھی اور اس خندق سے آگے فصیل کا شگاف تھا۔ فوجی لحاظ سے دن کے وقت جنرل ہیرس کا یہ حملہ خودکشی کے مترادف تھا اور آس پاس کے برجوں پر مٹھی بھر سپاہیوں کی مزاحمت بھی بڑی سے بڑی فوج کے عزائم خاک میں ملا سکتی تھی لیکن شگاف کے آس پاس فصیل پر جو افسر موجود تھے ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو غدارانِ وفن کے ساتھ اپنے ضمیر کا سودا کر چکے تھے۔ سید غفار کی ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکیوں سے مرعوب ہو کر انہوں نے فائرنگ شروع کی۔ لیکن ان کی توپوں اور بندوقوں کا کوئی نشانہ ٹھکانے پر نہیں لگتا تھا۔ صرف چند وفادار تھے جو فرض شناسی کا ثبوت دے رہے تھے۔

حملہ آوروں کی ایک ٹولی خندق کے قریب پہنچ چکی تھی۔ سید غفار نے ایک سپاہی کے ہاتھ سے بندوق چھین کر یکے بعد دیگرے چند فائر کیے اور چند آدمی زخمی ہو کر گر پڑے۔ اس کے ساتھ ہی ایک افسر اور پانچ سپاہی فصیل پر بھاگتے ہوئے شگاف کے قریب ایک مورچے میں داخل ہوئے اور انہوں نے تین غداروں کو موت کی گھاٹ اتارنے کے بعد مورچے کی توپوں پر قبضہ کر لیا اور دشمن پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس کے بعد دشمن کے توپ خانے حرکت میں آ گئے اور شگاف کے آس پاس گولے برسنے لگے۔ سید غفار فائر کرنے کے بعد بندوق بھر رہا تھا اور اس کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے توپوں کے گولے گر رہے تھے ایک وفادار سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا جناب یہاں سے ہٹ جائیں۔

سید غفار نے گرج کر کہا۔ تم میری طرف دیکھنے کی بجائے دشمن کی طرف خیال کرو۔

سپاہی کچھ کہے بغیر پیچھے ہٹ گیا۔ سید غفار نے اپنے دائیں طرف دیکھا تو ایک اور سپاہی چند قدم دور کھڑا اپنی بندوق زمین کی بجائے آسمان کی طرف کیے ہوئے تھے۔

غدار! سید غفار نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نیام سے تلوار نکالی اور اس کا سر قلم کر دیا۔ پھر وہ بلند آواز میں چلایا! ظالمو تم اگر اب بھی سنبھل جاؤ تو ہم یہ جنگ جیت سکتے ہیں۔ چند منٹ میں فوج کے دس ہزار سپاہی یہاں جمع ہو جائیں گے۔ سلطانِ معظم خود یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ خدا کے لیے ان لوگوں کا ساتھ دینے کی کوشش نہ کرو جو ذلت کے چند ٹکڑوں کی عوض تمہیں ہمیشہ کے لیے انگریزوں کا غلام بنا جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی توپ کا ایک گولہ سید غفار کے سر پر لگا اور فصیل پر اس کی لاش دکھائی دے رہی تھی۔

سید غفار کے گرتے ہی کسی نے فصیلہ پر سے سفید جھنڈا بلند کر دیا۔ پھر چند منٹ بعد جب سپاہیوں کے دستے وہاں پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ دشمن چند منٹ کے اندر اندر اُس دریا، اُس خندق اور اُس فصیل کو عبور کر چکا ہے جو برسوں سے اجنبی اقتدار کا راستہ روکے ہوئے تھی فصیل کے شگاف پر انگریزوں کا جھنڈا اس حقیقت کی گواہی دے رہا تھا کہ جو قوم اپنے آغوش میں غداروں کو پناہ دیتی ہے اس کے عظیم ترین قلعے بھی ریت کے گھروندے ثابت ہوتے ہیں۔

شگاف کے آس پاس پاؤں جمانے کے بعد انگریزوں کی فوج دو حصوں میں تقسیم ہو کر شمال اور جنوب کی فصیل پر یلغار کر رہی تھی اور جو دستے فصیل کے نیچے جمع

ہو رہے تھے انہیں سید غفار کی موت اور میر صادق کی غداری کی اطلاعات نے اس قدر بدر بد دل کر دیا تھا کہ وہ جوابی حملہ کرنے کی بجائے اندرونی فصیل کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اندرونی اور بیرون فصیلوں کے درمیان ایک اور خندق تھی جو پانی سے بھری ہوئی تھی۔ یہ خندق اگرچہ بیرونی خندق کی طرح زیادہ چوڑی نہ تھی تاہم اسے عبور کرتے وقت اندرونی فصیل کی حفاظت کرنے والے سپاہیوں کی گولہ باری انتہائی تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن انگریزوں کے چند دستوں نے کسی توقف کے بغیر حملہ کر دیا اور میسور کے سپاہوں کو دائیں بائیں دھکیلنے کے بعد دوسری خندق عبور کر کے اندرونی فصیل کے بعض حصوں پر قبضہ کر لیا۔

انور علی گھوڑا بھگاتا ہوا منتشر سپاہیوں کے قریب گیا اور اس نے ایک عقابی نگاہ سے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد بلند آواز میں کہا۔ میسور کے مجاہدو ہمت سے کام لو۔ سُلطان معظم تشریف لا رہے ہیں اور تھوڑی دیر میں ہمارے بیشتر فوج یہاں جمع ہو جائے گی۔ آگے بڑھو اور دشمن کی مزید فوج کو اندر آنے سے روکنے کی کوشش کرو۔ دشمن کے جو دستے قلعے کے اندر داخل ہو چکے ہیں ان پر یہ ثابت کر دو کہ چند گیدڑ ہزاروں شیروں کی آزادی کا سودا نہیں کر سکتے۔

انور علی نے یہ کہہ کر گھوڑے سے چھلانگ لگا دی اور تلوار سونت کر انگریزوں کے ایک دستے پر جو اندرونی فصیل کی طرف بڑھ رہا تھا ٹوٹ پڑا۔ جانبازوں کے چند دستوں نے اس کا ساتھ دیا اور انگریز اندرونی خندق کے قریب کئی لاشیں چھوڑنے کے بعد بیرونی فصیل کی طرف ہٹنے لگے۔

لیکن تھوڑی دیر میں انگریزوں کے کئی اور دستے وہاں پہنچ گئے اور میسور کے سپاہی اندرونی خندق کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف ہٹنے لگے۔ میسور کے چند سوار

گھوڑے دوڑاتے ہوئے لڑنے والے سپاہیوں کی عقب میں پہنچے اور ان میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا۔سپاہیو! دشمن ہمارے بیشتر مورچوں پر قبضہ کر چکا ہے۔ اب بے فائدہ جانیں دینے کی کوشش نہ کرو۔ ہتھیار ڈال دو میں تمہاری جانیں بچانے کا ذمہ لیتا ہوں۔

انور علی نے مُڑ کر دیکھا۔یہ میر معین الدین تھا اور اس کے ساتھ دوسرا سوار جو سفید جھنڈا اٹھائے ہوئے تھا۔میر صادق تھا۔تیسرا غدار قمر الدین اپنے ساتھیوں سے چند قدم پیچھے تھا۔انور علی غضبناک ہو کر بلند آواز میں چلایا۔سپاہیو! وہ غدار ہیں جنہوں نے ذلت کے چند ٹکڑوں کے عوض فرنگیوں کے ساتھ تمہاری عزت اور آزادی کا سودا کیا ہے۔اس جنگ میں تمہارے جو بھائی اور بیٹے شہید ہوں گے ان سب کا خون ان کی گردنوں پر ہے۔

انگیریزی فوج کے افسروں نے ان غداروں کو پہچانتے ہی اپنے سپاہیوں کو روک لیا اور ایک ثانیہ کے لیے لڑائی بند ہو گئی۔سرنگا پٹم کے سپاہی تذبذب اور پریشانی کی حالت میں کبھی دشمن اور کبھی میر معین الدین اور اسکے ساتھیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔اچانک میر قمر الدین نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑ کر ایڑ لگا دی۔ انور علی پھر چلایا۔بیوقوفو اپنے غداروں کو بھاگنے کا موقع نہ دو۔سُلطانِ معظم انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دے چکے ہیں۔

معین الدین اور اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ لیں۔ انور علی نے اپنا طپنچہ نکال کر فائر کیا میر صادق کے بازو پر گولی لگی اور اس کے ہاتھ سے سفید جھنڈا گر پڑا۔اس کے ساتھ ہی چند اور ساتھیوں نے بھی فائر کر دیے اور سات آدمی زخمی ہو کر بھاگتے ہوئے گھوڑوں سے گر پڑے۔ایک گولی میر معین

الدین کے گھوڑے کی ٹانگ میں لگی۔گھوڑا زخمی ہو کر خندق کے قریب گر پڑا اور میر معین الدین زین سے اچھل کر خندق میں جا گرا اس کے ساتھ ہی انگریزوں نے حملہ کر دیا اور انور علی اور اس کے بیشتر ساتھی ان کا سامنا کرنے پر مجبور ہو گئے۔لیکن چند آدمی بھاگتے ہوئے میر معین الدین کی طرف بڑھے۔وہ خندق سے نکل کر بھاگا۔لیکن ایک نوجوان نے اسے مشرقی دروازے سے کچھ فاصلے پر جا لیا۔میر معین الدین چلایا۔خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو میں نے کوئی غداری نہیں کی۔میں صرف تم لوگوں کو تباہی سے بچانا چاہتا تھا۔میں تمہارا وزیر ہوں۔میں تمہارے سلطان کا خادم ہوں۔میں۔۔۔۔۔

میر معین الدین اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔سپاہی کی تلوار اس کے سر پر لگی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔اس عرصہ میں تین سوار میر قمر الدین اور میر صادق کے پیچھے روانہ ہو چکے تھے۔

سلطان اپنے باڈی گارڈ دستوں کے ساتھ نمودار ہوا اور اسے دیکھتے ہی شمال کی اندرونی اور بیرونی فصیلوں کے درمیان لڑنے والے مجاہدین میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔اور وہ دشمن پر ٹوٹ پڑے، سلطان اپنے گھوڑے سے کود کر ان کی اگلی صف میں پہنچ گیا۔تھوڑی دیر میں مختلف اطراف سے میسور کے کئی دستے اس کے گرد جمع ہو کر جان کی بازی لگا رہے تھے۔لیکن اس دوران میں انگریزوں نے دونوں فصیلوں کے درمیان کئی مورچوں پر قابض ہو چکے تھے اور بلندی سے ان کی گولیاں سلطان کے جانبازوں کے لیے سخت مشکلات پیدا کر رہی تھیں۔

۔وہ افسر جو وطن کے غداروں کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر چکے تھے اس محاذ سے غیر حاضر تھے لیکن یہ مسئلہ اب میسور کے جانبازوں کے لیے کسی پریشانی کا

باعث نہ تھا۔ ان کی عزت اور آزادی کا محافظ ان کے ساتھ تھا۔ وہ یہ بھول چکے تھے کہ دشمن چند منٹ کے اندر اندر ہفتوں اور مہینوں کا سفر طے کر کے سرنگا پٹم میں داخل ہو چکا ہے۔ وہ یہ بھول چکے تھے کہ ان پر گولیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ وہ عظیم رہنما جس نے ان کے سینوں میں زندگی کے ولولے بیدار کیے تھے اب موت کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ لیکن اب موت کا چہرہ انہیں زندگی سے زیادہ حسین اور دلکش دکھائی دیتا تھا سلطان ٹیپو زخمی ہو چکا تھا اور وہ اپنے سینوں کے زخموں سے بھی ایک طرح کی آسودگی محسوس کرتے تھے۔ سلطان کا خون سرنگا پٹم کی خاک پر گر رہا تھا اور وہ اس خاک کے ہر ذرے کو اپنے خون سے سیراب کر دینا چاہتے تھے۔

دوسری گولی لگنے کے بعد شیرِ میسور پر نقاہت کے آثار ظاہر ہونے لگے، لیکن وہ لڑتا رہا۔ میسور کے جانباز زندگی اور موت سے بے پروا ہو کر اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اندرونی خندق کے آس پاس دشمن کی لاشوں کے ڈھیر لگے تھے۔ سینکڑوں انگریز زخمی ہونے کے بعد خندق میں گر کر دم توڑ رہے تھے۔ فصیلوں کے اوپر سے دشمن کی دوطرفہ فائرنگ ہر لحظہ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ میسور کے شہیدوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی تھی۔ جب زخموں کے باعث سُلطان کی ہمت جواب دینے لگی تو باڈی گارڈ دستے کے افسر نے کہا۔ عالی جاہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنے آپ کو دشمن کے حوالہ کر دیں۔

نہیں۔ سُلطان نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ میرے لیے شیر کی زندگی کا ایک لمحہ گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔

تھوڑی دیر بعد سلطان اپنے افسروں کے ساتھ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور

میسور کے سپاہی اس کے پیچھے قلعے کے اندرونی حصے کی طرف سمٹنے لگے۔ لیکن جب وہ شمالی دروازے کے قریب پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ وہاں بھی بعض مورچوں پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے۔ مسلح سپاہیوں کے علاوہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کا ایک بے پناہ ہجوم باہر نکلنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا اور انگریزی سنگینوں کی مدد سے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر رہے تھے۔ انہوں نے میسور کے سپاہیوں کو دروازے کی طرف آتے دیکھا تو پلٹ کر فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی قعلے کی فصیل کے بعض مورچوں سے بھی گولیوں کہ بارش ہونے لگی۔ ایک گولی سلطان کے گھوڑے کے پیٹ میں لگی اور اس نے گرتے ہی دم توڑ دیا۔ گھوڑے کے ساتھ گرتے وقت سلطان کی دستار اس کے سر سے علیحدہ ہو گئی۔ سلطان لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا لیکن ابھی وہ سنبھلنے نہ پایا تھا کہ اس کے سینے پر گولی لگی اور وہ نیم جان ہو کر گر پڑا۔ پاس ہی ایک انگریز نے سلطان کی کمر سے تلوار کی مرصع پیٹی اتارنے کی کوشش کی لیکن شیرِ میسور میں ابھی زندگی کے چند آخری سانس باقی تھے اور وہ یہ توہین برداشت نہ کر سکا۔ سلطان نے اچانک اُٹھ کر تلوار بلند کی اور پوری قوت کے ساتھ اس پر وار کر دیا۔ انگریز نے اپنی بندوق آگے کر دی۔ سُلطان کی تلوار بندوق پر لگی اور ٹوٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور انگیریز سپاہی نے اپنی بندوقت کی نالی کا سرا سلطان کی کنپٹی کے ساتھ لگاتے ہوئے فائر کر دیا اور وہ آفتاب جس کی روشنی میں اہلِ میسور نے آزادی کی حسین منازل دیکھی تھیں۔ ہمیشہ کے لیے رُوپوش ہو گیا۔



انور علی نے سُلطان کو اس وقت گرتے دیکھا تھا جب کہ اس کی بائیں ران پر گولی لگ چکی تھی اس کے ساتھی دروازے کے قریب انگریزوں کے ساتھ گُتھم گُتھا

ہو چکے تھے۔وہ چند سپاہیوں کو موت کی گھاٹ اتارنے کے بعد سلطان کی لاش کے قریب پہنچا تو فصیل سے ایک گولی اس کے سر پر لگی اور وہ ایک ثانیہ لڑکھڑانے کے بعد منہ کے بل گر پڑا۔اس عرصہ میں سُلطان شہید کی لاش پر چند جانبازوں کی لاشیں گر چکی تھیں۔اور انور علی کو نیم بے ہوشی کی حالت میں صرف اس کے پاؤں دکھائی دے رہے تھے۔وہ رینگتا ہوا آگے بڑھا اور اپنا سر سلطان کے پاؤں پر رکھ دیا۔گولی کھوپڑی کے اوپر سے پھسل جانے کے باعث سر کا زخم زیادہ گہرا نہ تھا۔اس سے قبل ٹانگ کے زخم سے خون بہنے کے باعث اس کے جسم میں کافی نقاہت آ چکی تھی۔اس نے ہوش میں آتے ہی اُٹھنے کی کوشش کی لیکن یکے بعد دیگرے چند اور جانباز زخمی ہو کر اس کے اُوپر گر پڑے۔

کچھ دیر بعد وہ بڑی مشکل سے لاشوں کے انبار سے نکلا تو میدان صاف ہو چکا تھا اور انگریزی فوج کے دستے دروازے کے سامنے دور دور تک بکھری ہوئی لاشیں روندتے ہوئے اندر داخل ہو رہے تھے۔انور علی دوبارہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور کچھ دیر دم سادھے پڑا رہا۔شہر کے دوسرے حصوں میں لوگوں کی چیخ و پکار یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ابھی تک اہلِ میسور کا قتلِ عام جاری ہے۔

سُلطان شہید ہو چکا ہے۔ ہماری آزادی کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں۔چند آدمیوں کی غداری کے باعث آج میسور کے کتنے بیٹے موت کے گھاٹ اتار دیے جائیں گے۔آج میسور کی کتنی بیٹیوں کی عصمت پر ڈاکے ڈالے جائیں گے کتنی عورتیں بیوہ اور کتنے بچے یتیم ہو چکے ہیں۔میرے بات، میرے بھائی اور میرے بے شمار دوستوں اور ساتھیوں کی قربانیوں کی ۔۔۔۔۔ ہے؟ صرف چند گھنٹے قبل ہم ایک آزاد وطن کے مالک تھے۔ہم اپنے ماضی پر فخر کر سکتے تھے اور ہمارے دلوں

میں حال کے مصائب سے لڑنے کی ہمت تھی۔ ہم اپنے مستقبل کے متعلق حسین سپنے دیکھ سکتے تھے اور اب ہمارا ماضی، ہمارا حال اور ہمارا مستقبل سب لاشوں کے اس انبار کے نیچے دفن ہو چکا ہے۔ سُلطان فتح علی ٹیپو شہید نہیں ہوا بلکہ ہم سب مر چکے ہیں۔ جس خاک پر سُلطان ٹیپو کا خون گرا ہے، ہماری آئندہ نسلیں تا قیامت اسے اپنے آنسوؤں سے سیراب کرتی رہیں گی۔ آج کے بعد میسور کا آفتاب ہمارے چہروں پر مسرت کی مسکراہٹیں نہیں دیکھے گا۔ میسور کی ہواؤں کی سرسراہٹ ہمارے سپنوں میں آزادی کے نغمے بیدار نہیں کرے گی۔ جس قوم کے اکابر نے سُلطان ٹیپو جیسے مُحسن کو دھوکا دیا ہے اسے کارکنان قضاو قدر رحم اور مُروت کا مستحق نہیں سمجھیں گے۔ انور علی اپنے دل میں اس قسم کے خیالات لے کر اُٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف چل دیا۔ غیر شعوری حالت میں اس کے پاؤں اپنے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے۔ کسی مکان سے چند عورتوں کی چیخیں سنائی دیں اور اس کی رفتار تیز ہونے لگی۔ اس کے تمام خیالات سمٹ کر منیرہ پر مرکوز ہو چکے تھے۔ سرنگا پٹم کی فضا میں اسے ہر چیخ منیرہ کی چیخ محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ اپنی تلوار لاشوں کے انبار میں چھوڑ آیا ہے۔ سامنے چند سپاہیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے جلدی سے جھک کر ایک سپاہی کی تلوار اٹھالی۔ اب گھر تک پہنچنا اس کے لیے زندگی کا اہم ترین مسئلہ بن چکا تھا اور وہ دشمن کی نگاہوں سے بچنے کے لیے ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔

میسور کے سپاہی افراتفری کی حالت میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ چند نوجوان انور علی کو پہچان کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک آدمی، انور علی، انور علی کہتا ہوا آگے بڑھا اور اسے بازو سے کھینچتا ہوا قریب ہی ایک مکان کی ڈیوڑھی میں لے

گیا۔ یہ قید خانے کا داروغہ تھا۔ انور علی چلایا۔ مجھے چھوڑ دو تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟

داروغہ نے کہا۔ آپ کے زخموں سے خون بند کرنا ضروری ہے۔

انور علی کے احتجاج کے باوجود داروغہ اور اس کے ساتھیوں نے اُسے زبردستی ایک کھاٹ پر لٹا دیا اور ایک سپاہی کا ٹپکا اتار کر اس کے زخموں پر پٹیاں باندھ دیں۔

آپ کے سر کا زخم زیادہ تشویشناک نہیں لیکن ٹانگ کا زخم بہت گہرا ہے۔ میں آس پاس کسی طبیب کو تلاش کرتا ہوں۔

انور علی کرب کی حالت میں اُٹھ کر چلایا۔ میرے پاس طبیب کا انتظار کرنے کے لیے وقت نہیں۔ داروغہ نے کہا۔ اگر آپ سلطانِ معظم کو تلاش کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی کوشش بے سُود ہے۔ شہر میں یہ افواہ گرم ہے کہ وہ سرنگا پٹم سے نکل گئے ہیں۔

یہ جھوٹ ہے۔ انور علی نے کہا۔ میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے شہید ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ انور علی کے گرد جمع ہونے والے آدمیوں کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ اندر سے ایک عمر رسیدہ عورت دھاڑیں مارتی ہوئی ڈیوڑھی میں داخل ہوئی اور اس نے کہا۔ سلطانِ معظم شہید ہو گئے ہیں اور تم ایک دوسرے کا منھ دیکھ رہے ہو۔ کاش میرا بیٹا آج زندہ ہوتا۔

داروغہ نے کہا۔ میری بہن اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر سلطان شہید ہو چکے ہیں تو ہمارے تلواریں ٹوٹ چکی ہیں اور ہمارے بازو کٹ چکے ہیں۔

گلی میں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ ایک سپاہی نے نیم وا دروازے سے جھانک کر باہر دیکھا اور پھر جلدی سے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ یہ نظام علی کی

فوج کے سپاہی ہیں۔

انور علی اور اس کے ساتھی تھوڑی دیر دم بخود ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے بالآخر جب سوار آگے نکل گئے تو ایک سپاہی نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر جھانکنے کے بعد کہا۔ وہ چلے گئے ہیں۔

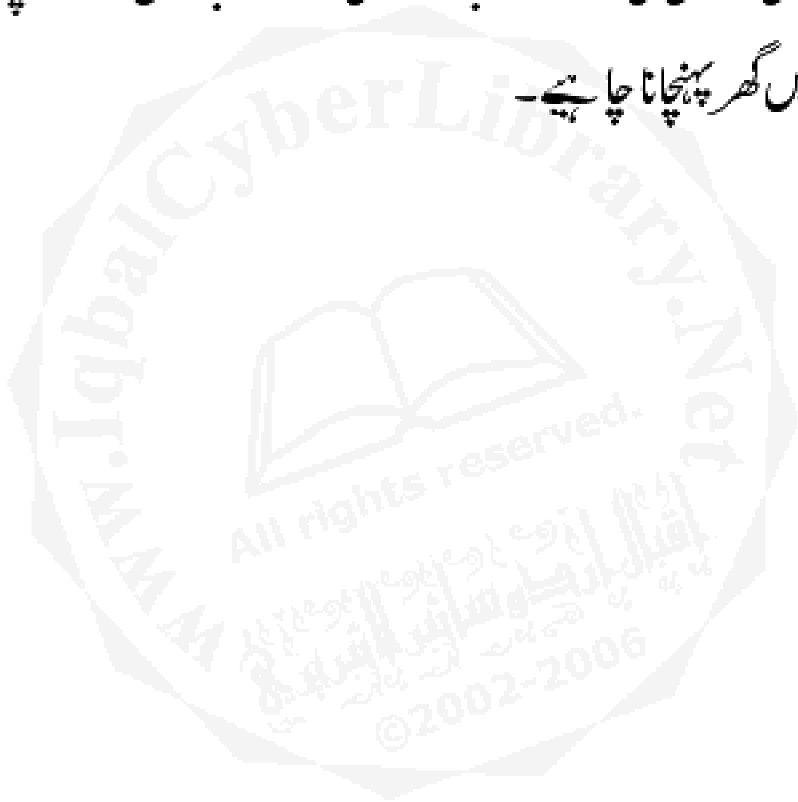
انور علی نے داروغہ سے مخاطب ہو کر کاہ۔ تم نے ملک جہان خاں کے متعلق کیا کیا ہے؟ کچھ نہیں داروغہ نے جواب دیا۔ ابھی تک قید خانے کی طرف نہیں جا سکا۔ میں میر صادق کی تلاش میں تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایک غدار کو ٹھکانے لگا کر شاید میں اپنے گناہوں کو بوجھ ہلکا کر سکوں لیکن مجھے یہ سعادت بھی نصیب نہ ہو سکی۔ میں نے میر صادق کی بجائے اس کی لاش دیکھی ہے۔ چند آدمی تلوار کے پے در پے ضربوں سے اس کا حلیہ بگاڑ رہے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ میر معین بھی مارا جا چکا ہے؟

انور علی نے کہا۔ اب ان غداروں کے متعلق سوچنے کا وقت نہیں تم فوراً قید خانے جاؤ اور ملک جہاں خان کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کرو۔ میری ہمت جواب دے چکی ہے ورنہ میں تمہارے ساتھ چلتا۔

داروغہ نے کہا۔ آپ کو میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر میں انگریزوں کے قبضہ سے پہلے قید خانے تک پہنچ سکا تو ملک جہان خاں کو آزاد کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

گلی میں عورتوں اور مردوں کی چیخ و پکار سُنائی دی۔ انور علی نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور جھانکنے لگا۔ تباہ حال شہریوں کا ایک ہجوم مشرق سے مغرب کی طرف بھاگ رہا تھا اور ان کے پیچھے چند انگریز مار دھاڑ کرتے چلے آ رہے تھے۔ انور علی کچھ دیر دروازے کے ساتھ کھڑا رہا۔ جب انگریز سپاہی لوگوں

کے ہجوم کو اپنی تلواروں سے ہانکتے ہوئے آگے نکل گئے تو وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ڈیوڑھی سے باہر نکلا اور عقب سے انگریزوں پر ٹوٹ پڑا۔ آن کی آن میں کوئی بیس انگریز زمین پر ڈھیر ہو گئے اس کے ساتھ ہی اہلِ شہر نے بھی پلٹ کر ان پر حملہ کر دیا۔ کوئی پانچ منٹ بعد انگریزی فوج کا پورا دستہ موت کی گھاٹ اتار جا چکا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انور علی کی قوت جواب دے گئی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ایک سپاہی نے کہا انہیں گھر پہنچانا چاہیے۔



اٹھائیسواں باب

انور علی کو ہوش آیا تو ہوا اپنے مکان کی نچلی منزل کے ایک کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ منیرہ، گھر کے نوکر اور محلے کا ایک طبیب اس کے بستر کے گرد کھڑے تھے۔ رات ہو چکی تھی اور کمرے کے اندر فانوس روشن تھا۔ ایک ثانیہ اپنے تیمارداروں کی طرف دیکھنے کے بعد انور علی کی نگاہیں منیرہ کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔ منیرہ سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ انور علی نے پانی مانگا اور منور جلدی سے پانی کا کٹورا بھر لایا۔ کریم خاں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور انور علی نے پانی پینے کے بعد دوبارہ سر تکیے پر رکھ دیا۔ طبیب نے اپنے تھیلے سے ایک شیشی نکال کر دوائی کے چند گھونٹ ایک پیالی میں ڈالے اور انور علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ یہ دوائی پینے کے بعد آپ کچھ طاقت محسوس کریں گے۔ میں آپ کے زخم دیکھ چکا ہوں۔ سر کا زخم جلد سے نیچے نہیں گیا اور گولی نکل جانے کے بعد ٹانگ کا زخم بھی زیادہ خطرناک نہیں۔ اگر خون بروقت بند ہو جاتا تو آپ کی یہ حالت نہ ہوتی۔

انور علی نے کوئی جواب دیے بغیر دوائی پی لی اور احسان مندی سے طبیب کی طرف دیکھنے لگا۔ منیرہ جو چند ثانیے قبل حزن و یاس تصویر نظر آتی تھی اب قدرے پُر امید ہو کر اپنے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ طبیب نے منیرہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ آپ ہر گھنٹے کے بعد انہیں اس دوائی کے دو گھونٹ پلاتی رہیں۔ اگر حالات نے اجازت دی تو میں صبح سے پہلے ایک بار پھر انہیں دیکھنے کی کوشش کروں گا۔

انور علی نے کہا۔ حکیم صاحب آپ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ آج سرنگا پٹم کی ہر گلی اور ہر گھر میں لاتعداد زخمی پڑے ہوئے ہیں آپ کو اُن کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

طبیب نے اپنا تھیلا اٹھاتے ہوئے کہا۔ شہر میں یہ افواہ ہے کہ سُلطانِ معظم شہید ہو چکے ہیں؟

ہاں! میں اُن کی لاش دیکھ چکا ہوں اور مجھے اس بات کا ملال ہے کہ میں ان کے قدموں میں سر رکھ کر جان نہ دے سکا۔

طبیب کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ منور کریم اور خادمہ کوئی ایک منٹ تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے پھر خادمہ انہیں ہاتھ سے اشارہ کرنے کے بعد دروازے کی طرف بڑھی اور وہ اس کے پیچھے چل دیے۔ انور علی نے منیرہ کی طرف دیکھا اور بے اختیار اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ منیرہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

منیرہ! انور علی نے اس کے سُنہری بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ میں جنت کے دروازے پر دستک دینے کے بعد واپس آ گیا ہوں۔ میں لاشوں کے انبار میں پڑا ہوا تھا۔ اور مجھے تمہاری آواز سنائی دے رہی تھی۔ مجھے یہ تمام واقعات ایک خواب معلوم ہوتے ہیں۔ آج سے کوئی چالیس سال قبل جب مُرشد آباد پر اسی قسم کی تاریکی چھا گئی تھی تو میرے والد نے میسور کے اُفق پر ایک نئی صبح کے آثار دیکھے تھے اور وہ سرنگا پٹم آ گئے تھے لیکن جو رات سرنگا پٹم پر آئی ہے وہ صبح کا پیام دینے والے ستاروں کے وجود سے خالی ہے۔ آج کے بعد آزادی کے متلاشیوں کے جو قافلے سرنگا پٹم سے نکلیں گے ان کے سامنے مُہیب تاریکیوں کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔

منیرہ تم جس ملک کی تاریکی سے گھبرا کر یہاں آئی تھیں آج اس کی فضاؤں میں آزادی کے نغمے گونج رہے ہیں۔ تمہارے ہم وطن اپنی قسمت پر ناز کر سکتے ہیں۔ لیکن میرے میسور کی عظمت قصہ ماضی بن چکی ہے۔ تمہاری رفاقت میں میری

زندگی کا ہر سانس مسرتوں سے لبریز تھا لیکن اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ کسی دن میری قوم کی تقدیر میر صادق جیسے غداروں کے ہاتھ میں آجائے گی تو میں تمہارا رفیقِ حیات بننے کی تمنا نہ کرتا۔ میں رُوئے زمین کی تمام خوشیاں تمہارے قدموں میں ڈھیر کرنا چاہتا تھا لیکن اب میری پونجی ایک لٹی ہوئی قوم کے آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں۔ جب میں لاشوں کے انبار میں پڑا ہوا تھا تو میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ کاش تم سرنگا پٹم میں نہ ہوتیں اور میں ایک شکست خوردہ قوم کی سسکیاں سُننے کی بجائے وہیں جان دے دیتا۔ میں مرنے سے پہلے تمہیں کسی محفوظ جگہ دیکھنا چاہتا تھا۔ کسی ایسی محفوظ جگہ جس کے مکین غداری اور ملت فروشی کے الفاظ سے نا آشنا ہوں۔

انور علی گفتگو کی دوران منیرہ کی آہیں سسکیوں اور سسکیاں دبی دبی چیخوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ جب اس نے سر اُٹھایا تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

انور! اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کرب انگیز لہجے میں کہا۔ میرا وطن فرانس نہیں سرنگا پٹم ہے اور مجھے اپنے حال یا مستقبل سے کوئی شکایت نہیں۔ مسرت کے وہ ایام جو مجھے آپ کی رفاقت میں نصیب ہوئے ہیں۔ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ آپ کے ساتھ مستقبل کی تاریک ترین منازل کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے میرے پاؤں نہیں ڈگمگائیں گے۔ اگر میسور کی زمین ہمارے لیے تنگ ہوگئی تو ہم کہیں دُور چلے جائیں گے۔ وہاں بھی مجھے اس سرنگا پٹم کی یاد ہمیشہ مسرور رکھے گی جس کا پہلا منظر میں نے آپ کے ساتھ کاویری کے کنارے ایک ٹیلے کی چوٹی سے دیکھا تھا۔ خوشی کے وہ لمحات جو میں نے آپ کے ساتھ اس گھر کی چار دیواری میں گزارے ہیں میری باقی زندگی کے مہینوں اور برسوں پر

حاوی رہیں گے۔

انور علی نے کہا۔منیرہ میں سرنگا پٹم چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔میں اس مٹی میں دفن ہونے کی سعادت سے محروم ہونا پسند نہیں کروں گا۔جس پر سُلطان ٹیپو کا خُون گرا ہے اور موت سے پہلے میسور میں میرے حصے کا بہت سا کام باقی ہے مجھے سرنگا پٹم کے شہیدوں کی ارواح کی قسم، میں اپنے ہم وطنوں کی عزت اور آزادی کو تجارت کا مال سمجھنے والے غداروں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔یہ گدھ فرنگی بھیڑیوں کے ساتھ مل کر ہماری بوٹیاں نہیں نوچ سکیں گے۔

کسی نے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور انور علی خاموش ہو گیا۔منیرہ نے پوچھا کون ہے؟

منور خاں نے اندر جھانکتے ہوئے کہا بی بی جی میں دودھ لایا ہوں۔

لے آؤ۔منیرہ نے کہا۔

منور خاں ایک طشت میں دودھ کا کٹورا لیے کمرے میں داخل ہوا۔منیرہ نے انور علی کو ہاتھ کا سہارا دے کر اٹھایا اور پھر طشت سے دودھ کا پیالہ اٹھا کر اس کے منھ سے لگا دیا۔دودھ کے چند گھونٹ پینے کے بعد انور علی دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔منور خاں پیالہ لے کر واپس جانے لگا تو انور علی نے کہا۔منور بالائی منزل کے بڑے کمرے سے تمام بندوقیں، طمنچے اور بارود لا کر میرے پاس رکھ دو۔

منیرہ نے کہا کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کو کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جائے جو اس گھر کی نسبت زیادہ محفوظ ہو۔شہر میں آپ کے کئی دوست ہیں؟

انور علی نے جواب دیا۔آج سرنگا پٹم میں میرے کسی دوست کا گھر محفوظ نہیں۔

منور خاں نے جلدی جلدی چار بندوقیں، دو طمنچے اور بارود کی پانچ تھیلیاں لا کر انور علی کے کمرے میں رکھ دیں اور کہا۔ جناب اگر حکم ہو تو بندوقیں بھر دوں؟

منور خاں نے فرش پر بیٹھ کر یکے بعد دیگرے بندوقیں بھر کر انور علی کے سرہانے دیوار کے ساتھ کھڑی کر دیں اور طمنچے تپائی پر رکھ دیے۔ اس کے بعد اس نے کہا۔ کریم خاں اور سائیں باہر ڈیوڑھی کے دروازہ پر پہرہ دے رہے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو ایک بندوق یہاں سے لیتا جاؤں۔ نہیں انور علی نے جواب دیا۔ تم انہیں میری طرف سے حکم دو کہ اگر کوئی مکان میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو وہ مداخلت نہ کریں۔ اب تم اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر کوئی مکان کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو تم مجھے خبردار کر دو۔

منور خاں کچھ دیر تذبذب کی حالت میں انور علی کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ بھائی جان میری ایک درخواست مان لیجیے۔

کہو!

بھائی جان میں چاہتا ہوں کہ اگر دشمن آ جائے تو آپ میرے لیے کمرے کا دروازہ بند نہ کریں۔ میں آخری دم تک آپ کا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔

نہیں منور۔ انور علی نے کرب انگیز لہجے میں کہا۔ تم جاؤ۔

منور نے آبدیدہ ہو کر انور علی کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر دروازے کی طرف چل دیا۔

ٹھہرو! انور علی نے کہا

منور رک گیا۔ انور علی نے منیرہ سے مخاطب ہو کر کہا منیرہ۔ امی جان کو وہ تھیلی

جو مُراد ہمارے حوالہ کر گیا تھا کہاں ہے؟

وہ اُوپر ایک صندوق میں پڑی ہے۔

اُسے لے آؤ۔

منیرہ کمرے سے باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد مخمل کی ایک تھیلی اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ انور علی نے بستر پر لیٹے لیٹے منیرہ کے ہاتھ سے تھیلی لے کر کھولی اور ایک ہیرہ نکال کر منور خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ منور لو یہ تمہارے کام آئے گا۔

نہیں۔ نہیں۔ منور نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا۔

منور! انور علی نے کہا۔ تم ہمیشہ میرا حکم مانا کرتے تھے یہ لے لو ورنہ میں خفا ہو جاؤنگا۔

منیرہ نے آگے بڑھ کر علی کے ہاتھ سے ہیرہ لے لیا اور منور کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

انور علی نے تین اور چھوٹے چھوٹے ہیرے تھیلی سے نکالے اور منور خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ یہ بھی لو منور۔ ان میں سے ایک کیم خاں دوسرا اور تیسرا خادمہ کو دے دو، اور انہیں یہ سمجھا دو کہ وہ کچھ عرصہ انہیں چھپا کر رکھیں۔ یہ بہت قیمتی ہیں۔

منور خاں نے ہیرے لے لیے اور پھر چند ثانیے غور سے انور علی کی طرف دیکھنے کے بعد کہا۔ بھائی جان آپ کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہمیں یہاں چھوڑ کر کہیں جا رہے ہیں۔

انور علی نے جواب دیا۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔

تو پر یہ ہیرے اپنے پاس کیوں نہیں رکھتے؟

انور علی نے قدرے تلخ ہو کر کہا۔ منور خدا کے لیے جاؤ!

منور اس تلخی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ اس نے سراپا احتجاج بن کر پہلے انور علی اور پھر منیرہ کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ انور علی نے مخمل کی تھیلی اپنے تکیے کے نیچے رکھ دی۔

☆

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور وہ دم بخود ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ کون ہے۔ انور علی نے جلدی سے طمنچہ اُٹھا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں جہان خان ہوں مجھے اندر آنے کی اجازت ہے؟

انور علی نے منیرہ کی طرف دیکھا اور اس نے ایک کھونٹی سے ایک سفید چادر اُتار کر اپنے اُوپر ڈال لی۔ انور علی نے آواز دی۔ آیئے!

ملک جہان خاں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں خُون آلود تلوار تھی اور لباس پر بھی خون کے چھینٹے نظر آتے تھے۔ اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ معاف کیجیے میں آپ کے نوکروں کو اطلاع کیے بغیر اندر آ گیا ہوں۔ سڑک پر جگہ جگہ انگریز سپاہی گشت کر رہے ہیں اور مجھے عقب سے دیوار پھاند کر اندر آنا پڑا۔ آپ کے متعلق داروغہ کی اطلاع بہت پریشان کن تھی۔ اب آپ کا کیا حال ہے؟

میں زخموں سے زیادہ تھکاوٹ کے باعث نڈھال ہو گیا تھا۔ آپ تشریف رکھیے!

نہیں میں راتوں رات یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ایسے حالات میں بھی ایک ساتھی کو فراموش نہیں کیا۔

اب آپ کہاں جائیں گے؟

مجھے معلوم ہوا ہے کہ شہزادہ فتح حیدر کا لشکر کری گٹا کی پہاڑی کے عقب میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور کسی تاخیر کے بغیر ان کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں۔ اگر شہزادے نے میر قمر الدین جیسے غداروں کی باتوں میں آ کر ہتھیار ڈال دیے تو میں آخری دم تک اس کا ساتھ دوں گا۔ ابھی تک سلطان کا جن وفادار ساتھیوں سے میری ملاقات ہوئی ہے ان سب کی یہی رائے ہے کہ ہم شہزادہ فتح حیدر کے پاس پہنچ جائیں۔ اب سرنگا پٹم کو تباہی سے بچانا ہمارے بس کی بات نہیں۔ شہر میں انگریزوں کی وحشت اور بربریت کی جو بھیانک مناظر دیکھنے میں آئے ہیں وہ ناقابل بیان ہیں۔ آج سرنگا پٹم میں کسی عورت کی عصمت محفوظ نہیں۔ میں نے اپنے ہاتھ سے پانچ انگریز قتل کیے ہیں۔ ایک گلی میں چند انگریز نے چار لڑکیوں کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور حیدر آباد کے سپاہی منت درازی سے انہیں چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے ساتھیوں نے اچانک حملہ کیا اور آن کی آن میں دس بارہ انگریزوں کو موت کی گھاٹ اتار دیا۔ حیدر آباد کے اکثر سپاہی غیر جانبدار رہے لیکن چند ایسے بھی تھے جنہوں نے لڑائی میں ہمارا ساتھ دیا۔

انور علی نے پوچھا آپ نے شاہی محل کے حالات معلوم کیے ہیں؟

نہیں، اس طرف کے تمام راستے بند ہیں۔ میں صرف اتنا معلوم کر سکا ہوں کہ آٹھ بجے تک محل کے دروازے پر شدید لڑائی ہو رہی تھی اور فرانسیسی دستہ محل کے محافظوں کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد یک لخت فائرنگ بند ہو گئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ قلعے کا کماندار میر ندیم دشمن کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ان حالات میں اگر لڑائی جاری رہتی تو بھی انگریزوں کو محل پر قبضہ کرنے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔ مجھے

افسوس ہے کہ آپ زخمی ہیں اور میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ دشمن شاہی محل سے فارغ ہوتے ہی ایک نئی شدت کے ساتھ لوٹ مار اور قتل و غارت شروع کریں گے اور آپ کا مکان انتہائی غیر محفوظ ہوگا کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آپ کو کسی ایسے دوست کے پاس پہنچا دیا جائے جس کا گھر نسبتاً محفوظ ہو؟

انور علی نے جواب دیا۔ آج میرے لیے سرنگا پٹم کے تمام گھر یکساں غیر محفوظ ہیں۔ مجھے اس وقت کوئی پریشانی ہے تو اپنی بیوی کے متعلق ہے اگر آپ انہیں شہزادہ فتح حیدر کے پاس پہنچا سکیں تو یہ مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔

جہاں خاں نے کہا۔ اگر یہ فوراً چلنے کے لیے تیار ہو جائیں تو میں انہیں شہزادہ کے پاس پہنچانے کا ذمہ لے سکتا ہوں۔ لیکن چند گھنٹے بعد یہ کام بہت مشکل ہوگا۔

منیرہ نے سراپا احتجاج بن کر کہا۔ نہیں، نہیں، میں آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔

انور علی نے کہا۔ منیرہ تمہارا میرے ساتھ رہنا ٹھیک نہیں۔ اگر میں گرفتار ہو گیا تو انگریز زیادہ سے زیادہ مجھے اس وقت تک قید میں رکھیں گے جب تک کہ میسور کے کسی لشکر کی طرف سے مزاحمت کا خدشہ باقی رہے گا لیکن ان درندوں کے ہاتھوں سرنگا پٹم کی کسی عورت کی عزت محفوظ نہیں اور اگر انہیں یہ پتہ چل گیا کہ تم فرانسیسی قوم سے تعلق رکھتی ہو تو تمہارا انجام شاید میری قوم کی بہو بیٹیوں سے زیادہ المناک ہوگا۔

منیرہ نے کہا۔ اب میں فرانسیسی نہیں بلکہ میسور کی بہو بیٹیوں میں سے ایک ہوں۔

جہاں خاں نے کہا۔ میرے بہن سرنگا پٹم کے لیے یہ تین چار دن بہت خطرناک ہیں آپ کو معلوم نہیں کہ یہ قوم فتح کے نشے میں کیا کیا کرتی ہے۔

منیرہ نے کہا۔ مجھے معلوم ہے لیکن میری عزت، میری زندگی اور موت میرے شوہر کے ساتھ ہے۔ میں انہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔

انور علی نے کہا۔ منیرہ! آئندہ ایک دو دن سرنگاپٹم پر فاتح لشکر کی حکومت ہوگی اور انسانیت کو سر چھپانے کے لیے جگہ نہیں ملے گی۔ جب یہ طوفان گزر جائے گا تو میں تم سے آملوں گا۔ میں منور اور کریم خاں کو تمہارے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ اگر ملک جہاں خاں تمہارے لیے میسور کی حدود میں کوئی جائے پناہ تلاش نہ کر سکے تو یہ تمہیں چچا اکبر خاں کے گاؤں پہنچانے کا انتظام کر دیں گے اور مجھے یقین ہے کہ حالات سازگار ہونے تک ثمینہ اور اس کی والدہ تمہیں اپنے گھر میں پناہ دے سکیں گی۔

منیرہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اس وقت آپکو میری ضرورت ہے۔ اور ان الفاظ کے ساتھ منیرہ کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔

جہاں خاں نے کہا۔ انور علی، میری بہن درست کہتی ہے۔ آپ کو ان کے متعلق فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ انگریز شراب کے نشے میں بھی ایک فرانسیسی لڑکی کے ساتھ کوئی بدسلوکی کرنے کی جرات نہیں کریں گے۔ ہمارا ٹیپو شہید ہو چکا ہے۔ ہم اپنی تلوار اور ڈھال سے محروم ہو چکے ہیں لیکن فرانس کا نپولین ابھی تک زندہ ہے۔ میں آپ سے اجازت لیتا ہوں۔

جہاں خاں دروازے کی طرف بڑھا لیکن انور علی نے کہا۔ ٹھہریے میں آپ سے ایک اور درخواست کرنا چاہتا ہوں۔

کہیے۔ جہاں خاں نے مُڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

مُراد علی ابھی تک افغانستان کی مہم سے واپس نہیں آیا۔ اگر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تو اُسے ایک یا دو ہفتوں کے اندر اندر یہاں پہنچ جانا چاہیے۔ اگر وہ کہیں

آپ سے ملے تو اسے موجودہ حالات میں سرنگا پٹم آنے سے منع کیجیے۔ اسے میری طرف سے کہیے کہ اکبر خان کے گھر میں تمھارا انتظار ہو رہا ہے۔ پچھلے دنوں ان کی طرف سے ایک ایلچی تمہارا حال معلوم کرنے آیا تھا۔ اگر آپ کو گھوڑے کی ضرورت ہو تو میرے اصطبل سے لے جایئے۔

نہیں، اس وقت گھوڑے پر سوار ہو کر سرنگا پٹم سے نکلنا بہت مشکل ہے۔

اچھا خدا حافظ۔ انور علی نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ جہاں خاں نے اس کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد منیرہ کو سلام کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

انور علی نے منیرہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ منیرہ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔

کس بات پر؟

تم نے میرا کہا نہیں مانا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر تمہیں یہاں سے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اگر تم میرا مشورہ مان لیتیں تو ممکن تھا تمہیں رخصت کرنے کے چند ثانیے بعد دیوانگی کی حالت میں باہر نکل آتا اور چلا چلا کر کہتا۔ منیرہ منیرہ! واپس آجاؤ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ منیرہ تشکر کے آنسوؤں کے ساتھ اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔

انور علی نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ تم دروازہ بند کر دو اور روشنی بُجھا دو۔ اگر باہر سے کوئی آہٹ سُنائی دے تو مجھے جگا دینا۔ مجھے حبس محسوس ہو رہی ہے ایک کھڑکی کھول دو۔ لیکن جب تمہیں نیند آنے لگے تو اسے بند کر دینا۔



غروبِ آفتاب سے کوئی تین گھنٹے بعد سرنگا پٹم کے شہر، قلعے اور محل پر انگریزوں

کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا اور میر عالم کی قیادت میں دکن کی فوج کے چند دستے بھی شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ شہر کی چار دیواری کے اندر میسور کے بارہ ہزار سورماؤں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں لیکن ابھی تک ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر نظام علی کے سپاہیوں کے لیے یہ فتح نامکمل تھی۔ وہ سلطان کی تلاش میں محل کا کونا کونا چھان چکے تھے۔ غداروں کی نشاندہی پر سلطان کے وفادار افسروں کے گھروں کی تلاشی ہو رہی تھی۔ کمسن شہزادوں کو دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ زخمیوں اور نہتوں کے سینوں پر سنگین رکھ کر یہ پوچھا جا رہا تھا کہ سلطان کہاں ہے؟ سرنگا پٹم کے بیشتر سپاہی سلطان کی شہادت کے وقت مختلف محاذوں پر لڑ رہے تھے اور وہ انگریزوں کو کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکتے تھے لیکن جن سپاہیوں نے اپنی آنکھوں سے اپنے محبوب حکمران کو گرتے دیکھا تھا انہیں بھی کوئی خوف یا لالچ سلطان کی شہادت کے متعلق کچھ بتانے پر آمادہ نہ کر سکا۔ ان میں سے بعض سلطان کو زندہ سمجھ کر اسے لاشوں کے انبار سے نکالنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے اور جنہیں سلطان کی موت کا یقین ہو چکا تھا انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ دشمن کے ناپاک ہاتھ سلطان کی لاش تک پہنچ سکیں۔

سلطان شہید ہو چکا ہے لیکن اس کے وفادار ساتھیوں نے اس کی لاش کہیں گم کر دی ہے۔ سلطان شہید نہیں ہوا۔ سلطان زخمی ہونے کے بعد کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ سلطان حملے سے پہلے ہی سرنگا پٹم سے جا چکا تھا۔ سلطان شہزادہ فتح حیدر کے پاس پہنچ چکا ہے۔ سلطان سرا پا چتل ڈرگ کو اپنا مستقر بنا کر لڑائی جاری رکھے گا۔ اس قسم کی افواہیں صرف انگریزوں اور میر نظام علی کی فوج کے افسروں کیلئے ہی نہیں بلکہ ان غداروں کے لیے بھی انتہائی پریشان کن تھیں جو میسور کی آزادی کے عوض اپنے

آقاؤں سے بری بڑی جاگیروں کے وعدے لے چکے تھے۔ میر صادق اور معین الدین کا انجام دیکھنے کے بعد انہیں اپنے انجام کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی۔

آدھی رات کے قریب محل کے سامنے میر قمر الدین، پورنیا اور بدر الزماں چند انگریز افسروں کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ چند سپاہی مشعلیں لیے ان کے گرد کھڑے تھے۔ میر ندیم بھاگتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور بلند آواز میں چلایا۔ مجھے ابھی سُلطان کے متعلق اطلاع ملی ہے اس کی لاش شمالی دروازے کے سامنے دوسری لاشوں کے انبار میں دبی ہوئی ملی ہے۔ چلیے میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں۔

وہ کسی توقف کے بغیر اس کے ساتھ چل دیے۔

تھوڑی دیر بعد وہ لاشوں کے انبار کے گرد کھڑے تھے۔ انگریز افسر کا حکم سے تمام لاشیں ایک ایک کر کے علیحدہ کی جانے لگیں۔ چند لاشیں ہٹانے کے بعد ایک انگریز سپاہی نے ایک لاش کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹنے کی کوشش کی تو اُسے اپنے ہاتھ میں کسی سخت چیز کی چبھن محسوس ہوئی۔ اس کی ساتھ ہی لاش کے سر سے پگڑی اُتر گئی اور اس کے لمبے لمبے سیاہ بال بکھر گئے۔ انگریز سپاہی نے انگریزی زبان میں کچھ کہہ کر اپنے افسروں کو اس طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے مشعلیں قریب کر کے دیکھا تو یہ ایک عورت تھی جس کی باہوں میں سونے کے کنگن چمک رہے تھے۔ اس کے بعد ایک اور عورت کی لاش برآمد ہوئی جس کا جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔ پورنیا نے ایک سپاہی کے ہاتھ سے مشعل لے کر غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

آپ اسے پہچانتے ہیں؟ ایک انگریز افسر نے سوال کیا۔

ہاں، یہ ایک یتیم ہندو لڑکی ہے جسے سلطان نے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ اس کا باپ

گزشتہ جنگ میں مارا گیا تھا۔

اور دوسری عورت کون ہے؟

اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔

تھوڑی دیر بعد باقی تمام لاشیں ہٹائی جا چکی تھیں اور یہ لوگ سکتے کے عالم میں شیرِ میسور کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سُلطان ٹیپو کا لباس خُون سے تر تھا لیکن اس کے چہرے کے رُعب و جلال میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ٹوٹی ہوئی تلوار کا قبضہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا لباس فوج کے افسروں سے مختلف نہ تھا۔ وہ دستار جو اسے دوسروں سے ممیّز کرتی تھی۔ چند قدم دُور پڑی ہوئی تھی۔ بدرالزمان نے آگے بڑھ کر دستار اٹھالی۔

ایک افسر نے پوچھا۔ یہ سلطان ٹیپو ہے؟

میر قمرالدین نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ جی ہاں۔ آپ کو فتح مبارک ہو۔

انگریز سپاہی چلایا۔ یہ زندہ ہے! اور چند آدمیوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں۔ انگریز افسر جھجکتا ہوا آگے بڑھا اور سلطان کی نبض ٹٹولنے کے بعد اس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ یہ مر چکا ہے۔

بدرالزمان نے سلطان کی دستار کو اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ اس کے قاتل آپ نہیں ہم ہیں۔ ہم نے اسے قتل کیا ہے اور ہماری آئندہ نسلیں اس کی قبر پر پھول چڑھایا کریں گی۔

ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ انگریز افسر یہ کہہ کر میر قمرالدین کی طرف متوجہ

ہوا۔آپ انہیں پالکی میں ڈال کر محل میں پہنچانے کا انتظام کریں۔میں جنرل ہیرس کو اطلاع دیتا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد قلعے کے ہر گوشے سے فتح کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔پھر انگریز سپاہی اُچھلتے کودتے، چیختے چلاتے قلعے سے نکلے اور لوگوں کے گھروں کا رُخ کرنے لگے۔وہ جتھے شہر کے مختلف حصوں میں سُلطان کو تلاش کر رہے تھے، ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور لوٹ مار، قتل و غارت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

کارکنانِ قضاوقدر نے اس قوم کی ہزاروں بیٹیوں کی چیخ و پکار کی طرف سے کان بند کر لیے تھے جس کی چند ماؤں نے میر صادق جیسے غداروں کو دُودھ پلایا تھا۔سرنگاپٹم کا کوئی گھر وحشت اور بربریت کے اس طوفان سے محفوظ نہ تھا۔یہاں تک کہ وہ غدار بھی جنہوں نے میر صادق، پورنیا، قمر الدین اور معین الدین جیسے بے ضمیر انسانوں کا ساتھ دیا تھا اب یہ محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے صرف قوم کی آزادی اور قوم کے شہیدوں کی قیمت ہی وصول نہیں کی بلکہ اپنی بہو بیٹیوں کی عزت کا سودا بھی کر چکے ہیں۔میر صادق اور میر معین الدین اپنی غداری کا صلہ حاصل کرنے سے پہلے ہی قتل ہو چکے تھے لیکن ان کی ارواح انہی درندوں کے ہاتھوں اپنے گھروں کی بربادی کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔جن کے لیے انہوں نے سرنگاپٹم کا راستہ صاف کیا تھا۔ان کی بہو بیٹیوں کے لباس نوچے جا رہے تھے اور شراب سے بدمست انگریز اُن کی چیخوں کے جواب میں قہقہے لگا رہے تھے۔

میں میر صادق کی بیوی ہوں۔میں میر صادق کی بہن ہوں۔میں میر صادق کی بیٹی ہوں۔یہ میر معین الدین کا گھر ہے۔وہ لارڈ ولزلی کے دوست تھے۔جنرل ہیرس انہیں جانتا ہے۔انہیں لوگوں نے انگریزوں کا دوست ہونے کے جُرم میں قتل

کر دیا ہے۔تم دوسرے کمرے میں اس کی لاش دیکھ سکتے ہو۔تمہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوست اور اپنی قوم کے محسن کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔ میں میر معین الدین کا بیٹا ہوں۔ یہ میری بیوی ہے۔ یہ میری بہنیں ہیں۔ہمیں جنرل ہیرس کے پاس لے چلو۔ انگریزوں کے پاس مُہیب قہقہوں کے سوا ان کی التجاؤں کا کوئی جواب نہ تھا۔

جو لوگ سُلطان کی موت کے بعد جنگ کے نتائج کے متعلق مایوس ہو کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے تھے وہ اب گھروں کی حفاظت کے لیے لڑ رہے تھے اور سرنگا پٹم کی گلیوں اور بازاروں میں خُون کی ایک نئی تہہ جم رہی تھی۔

☆

انور علی بندوقوں کے لگاتار دھماکوں اور عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار سُن کر گہری نیند سے بیدار ہوا تو صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔منیرہ ایک بندوق اٹھائے نیم وا دریچے کے سامنے کھڑی صحن کی طرف جھانک رہی تھی۔ انور علی نے اُٹھ کر دوسری بندوق پکڑتے ہوئے پوچھا کیا ہے منیرہ؟

ہمارے مکان کے آس پاس چاروں طرف لوٹ مار شروع ہو چکی ہے۔انور علی جلدی سے دریچے کی طرف بڑھا تو اسے اپنے زخموں میں ٹیسیں محسوس ہونے لگیں۔اس نے منیرہ کو ایک طرف ہٹا کر دریچہ سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔تم نے مجھے کیوں نہ جگایا؟

آپ گہری نیند سو رہے تھے اور آپ کو آرام کی ضرورت تھی۔ میں نے سوچا اگر کوئی اس طرف آیا تو آپ کو جگا دوں گی۔

انور علی نے دریچے کے سامنے گُھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا۔تمہیں اس

طرح دریچے کے سامنے کھڑا نہیں ہونا چاہیے تھا اور تمہیں بندوق چلانے کی بھی ضرورت نہیں تم اگر ضرورت کے وقت صرف خالی بندوق بھر بھر کر مجھے دیتی رہو تو یہ کافی ہو گا۔

منیرہ نے باقی تمام اسلحہ اٹھا کر دریچے کے قریب رکھ دیا اور انور علی کے قریب بیٹھ گئی۔ اسے خوف اور اضطراب کا ایک ایک لمحہ مہینوں سے زیادہ طویل معلوم ہوتا تھا۔ چند منٹ بعد ڈیوڑھی کی طرف شور سُنائی دیا اور انور علی ذرا گردن اُونچی کر کے باہر جھانکنے لگا۔

منور خاں بھاگتا ہوا صحن میں داخل ہوا اور اس نے برآمدے کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں کہا۔ بھائی جان۔ بھائی جان! وہ پڑوس کے مکان میں آگ لگا کر اس طرف آگئے ہیں اور ہماری ڈیوڑھی کا دروازہ توڑ رہے ہیں۔

انور علی نے دریچے سے باہر سر نکالتے ہوئے کہا۔ منور کریم خاں سے کہو کہ دروازہ کھول دے اور اپنی بندوق انکے سامنے پھینک دے۔

منور خاں نے بدحواس ہو کر جواب دیا۔ جناب اگر ڈیوڑھی کا دروازہ کھول دیا گیا تو وہ فوراً اندر آجائیں گے۔

تم ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے بھی انہیں اندر آنے سے نہیں روک سکتے۔

منور خاں نے آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔ بھائی جان خدا کے لیے مجھے اندر آنے دیجیے۔ میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ میں بندوق چلا سکتا ہوں۔

انور علی مضطرب ہو کر آگے بڑھا اور دروازے کی کُنڈی کھولنے کے بعد منور خاں کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ تم اپنی

کوٹھڑی میں پڑے رہو۔ جو لوگ میری تلاش میں آتے ہیں وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ یہاں تم میری کوئی مدد نہیں کر سکتے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ تم بلاوجہ مارے جاؤ۔ اگر انہوں نے ہمیں کسی انسانی سلوک کا حقدار سمجھا تو میرے نوکروں کو بھی کوئی خطرہ نہیں اور اگر ہمیں اپنی عزت بچانے کے لیے جان کی بازی لگانی پڑی تو بھی تم لوگ ہم سے دور رہ کر اپنی جانیں بچا سکو گے۔ ہمیں مرنے کے لیے اپنے ساتھیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب باتوں کا وقت نہیں۔ جاؤ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلو دو۔ اگر وہ پوچھیں تو انہیں یہ بتادو کہ اس گھر میں ایک زخمی اور ایک عورت کے سوا کوئی نہیں۔

منور خاں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن انور علی نے اسے باہر صحن کی طرف دھکیل کر جلدی سے دروازہ بند کرلیا۔ خادمہ کانپتی کانپتی دریچے کے سامنے نمودار ہوا اور انور علی اسے دیکھتے ہی چلایا۔ چچی آپ یا تو اپنی کوٹھڑی میں پڑی رہیں ورنہ چھت کے اوپر چلی جائیں اور جب تک ہم آواز نہ دیں اس طرح آنے کی کوشش نہ کریں۔

خادمہ ایک ثانیہ پریشانی اور اضطراب کی حالت میں کھڑی رہی اور پھر تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی زینے کی طرف چلی گئی۔ انور علی دریچے کے سامنے بیٹھ گیا۔ ڈیوڑھی کی طرف آدمیوں کا شور بتدریج بڑھ رہا تھا منیرہ دم بخود ہو کر اپنے شوہر کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ آپ کے زخم تکلیف تو نہیں دیتے؟

نہیں میرا سر کچھ بوجھل ہے۔ ابھی اٹھ کر دروازہ کھولتے وقت مجھے چکر آ گیا تھا۔ اب ٹھیک ہوں منیرہ تمہیں ڈر تو نہیں لگتا؟

نہیں آپ کی موجودگی میں مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔

انور علی نے کہا۔ منیرہ میرا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مجھے اگر کوئی خوف ہے تو

وہ یہ ہے کہ تم میرے ساتھ ہو۔وہ آرہے ہیں۔منیرہ وہ آرہے ہیں!

منیرہ نے نیم وادریچے سے باہر دیکھاتو مسلح انگریزوں کی ایک ٹولی صحن کے اندر داخل ہورہی تھی۔انور علی نے اسے اپنے ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔منیرہ اپنا سر نیچے رکھو۔

پندرہ بیس مسلح انگریز صحن کے دروازے کے آگے رُکے۔پھر دو آدمی بندوقیں سیدھی کیے آگے بڑھے۔انور علی نے اپنی بندوق کی نالی باہر نکالتے ہوئے بلند آواز سے انگریزی زبان میں کہا۔ٹھہرو۔

وہ رُک گئے۔ایک سپاہی نے کہا۔ہم تمہارے مکان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں تمہیں ہتھیار پھینک کر باہر آنے کے لیے ایک منٹ دیا جاتا ہے۔ایک منٹ کے بعد ہم فائرنگ شروع کردیں گے۔پھر تم کسی رعایت کے مستحق نہیں سمجھے جاؤگے۔ہمیں معلوم ہے کہ تم زخمی ہو۔

انور علی نے کہا۔میں تمہارے کسی ذمہ دار افسر کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں۔

ہمارے افسر آج بہت مصروف ہیں اور شاید تمہیں معلوم نہیں ہم باغیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ تم انسانیت کے بدترین دشمن ہولیکن اگر تم میرا گھر لوٹنا چاہتے ہوتو میں مزاحمت نہیں کروں گا۔تمہیں مجھے صرف یہ اطمینان دلانا پڑے گا کہ اگر میں ہتھیار ڈال دوں تو میرے ساتھ ایک جنگی قیدی کا سلوک کیا جائے گا اور یہ اطمینان مجھے اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب کہ تمہاری فوج کا کوئی بااختیار افسر یہاں موجود ہو۔تمہارے ساتھ یہ وعدہ کرنے کے لیے تیار ہوں کہ جب مجھے یہ اطمینان ہو

جائے گا کہ تم میرے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کرو گے تو اس گھر کی کوئی چیز تم سے چھپانے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

پیچھے کھڑے ہونے والے انگریزوں کی ٹولی سے کسی نے آواز دی۔ ہمیں ایسے بیوقوفوں کے ساتھ باتیں کرنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اب ایک منٹ ختم ہو چکا ہے۔

دونوں سپاہی جو انور علی سے باتیں کر رہے تھے واپس مڑ کر اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ پھر وہ ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔

انور علی نے کہا۔ منیرہ اگر مجھے تمہارے متعلق یہ اطمینان ہوتا کہ وہ تمہارے ساتھ بدسلوکی نہیں کریں گے تو میں ہتھیار پھینک کر باہر نکل جاتا۔ لیکن یہ تمام سپاہی ہیں اور شراب سے بدمست ہیں۔ مجھے ان سے کسی انسانی سلوک کی توقع نہیں۔

منیرہ منیرہ فرش پر لیٹ جاؤ۔ اُوپر سر اُٹھانے کی کوشش نہ کرو!

انور علی کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ صحن میں بندوقوں کے دھماکے سُنائی دینے لے اور کئی گولیاں بند دروازے اور نیم وا دریچے کے پٹ چیرتی ہوئی عقبی دیوار سے جا ٹکرائیں۔ انور علی نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے اور دو آدمی گولی کھا کر گر پڑے، باقی افراتفری کے حالت میں پسپا ہونے لگے انور علی نے آن کی آن میں دو اور آدمیوں کو گولی کا نشانہ بنانے کے بعد دونوں طمنچے اٹھا لیے لیکن اتنی دیر میں صحن خالی ہو چکا تھا۔ چند انگریز اندرونی صحن سے باہر نکل کر باہر کے احاطے میں پہنچ چکے تھے اور باقی مکان کی دائیں طرف آم کے دو درختوں کے پیچھے غائب ہو چکے تھے۔

پانچ منٹ تک کمرے میں مکمل سکوت طاری رہا اور اس عرصہ میں انور علی اور

منیرہ خالی بندوقیں بھر چکے تھے۔ پھر صحن کی دیوار کے اُوپر سے گولیاں آنے لگیں اور انور علی کو کچھ دیر دریچے کے سامنے سر اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ منیرہ نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ آپ ٹھیک ہیں نا؟

میں ٹھیک ہوں تم اپنا سر نیچے رکھو۔

فائرنگ اچانک بند ہوگئی۔ انور علی نے ذرا گردن اُٹھا کر باہر جھانکا تو اُسے سامنے صحن کی دیوار کے عقب سے چند انگریزوں کی ٹوپیاں دکھائی دیں۔ وہ دنوں ہاتھوں میں طمنچے لیے دریچے سے ذرا بائیں طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا اور ایک طرف جھک کر باہر جھانکنے لگا اب ان آدمیوں کے سر اس کے زد میں تھے جو صحن کی دیوار کے عقب میں کھڑے تھے۔ وہ بیک وقت دنوں آدمیوں کو اپنے طمنچوں کا نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے صحن کی بائیں طرف کے درختوں میں کوئی آہٹ محسوس ہوئی اور وہ دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ درخت کی ایک شاخ جس کا کچھ حصہ وہ دریچے سے دیکھ سکتا تھا ہل رہی تھی۔ اس نے گردن ذرا آگے کی تو اسے پتوں کی آڑ میں ایک شاخ پر کوئی آدمی دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں بندوق کا دھماکا سُنائی دیا۔ گولی اس کے کندھے پر لگی۔ وہ اپنے زخم پر ہاتھ رکھ کر لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف ہٹا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ منیرہ کے منھ سے ایک چیخ نکلی اور وہ اسے سہارا دینے کے لیے اُٹھ کر آگے بڑھی۔ وہ چلایا۔ منیرہ لیٹ جاؤ۔ منیرہ!

بندوق کا ایک اور دھماکہ سنائی دیا اور منیرہ اس کے قدموں پر گر پڑی۔ انور علی کے ہاتھوں سے طمنچے گر پڑے اور وہ منیرہ منیرہ کہتا ہوا اس کا سر گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ لیکن منیرہ کے پاس اس کی التجاؤں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کی پیشانی سے

خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنی اُمیدوں، آرزوؤں، آنسوؤں اور مسکراہٹوں کی دُنیا کو الوداع کہہ رہا تھا۔

منیرہ منیرہ! میری منیرہ، میری جیین!! انور علی نے اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا تم نے وعدہ کیا تھا کہ زندگی اور موت میں ہم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔

اس نے منیرہ کو فرش پر لٹا دیا اور طمنچے اٹھا کر دریچے کی طرف بڑھا۔ اسے اپنے زخموں کا احساس نہ تھا۔ اسے دیوار کی طرف سے دشمن کی گولیوں کی پروا نہ تھی۔ وہ زندگی اور موت سے بے نیاز دریچے سے باہر نکالے درخت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آن کی آن میں اس نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے اور دو لاشیں زمین پر آ رہیں۔ اس کے ساتھ ہی دیوار کی طرف سے بیک وقت چند گولیاں آئیں اور انور علی اپنے بازو اور پسلیوں پر زخم کھانے کے بعد گر پڑا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے ایک بندوق پکڑلی اور رہی سہی قوت بروئے کار لاتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا بایاں بازو جو اب دے چکا تھا۔ بیرونی احاطے میں گھوڑوں کی ٹاپ اور اس کے ساتھ ہی بگل کی آواز سنائی دی اور فائرنگ بند ہو گئی۔ انور علی ایک ہاتھ سے بندوق کا سرا دریچے میں رکھ کر باہر جھانکنے لگا۔ کچھ دیر اسے باہر جمع ہونے والے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر صحن کے دروازے کی طرف سے کسی نے بلند آواز میں کہا۔ انور علی! مُراد علی میں ہاشم بیگ ہوں، فائرنگ بند کر دو۔ کرنل ولزلی نے تمہاری جان بچانے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ میرے ساتھ ہیں۔ میں اندر آ رہا ہوں۔ میں ہاشم بیگ ہوں۔

چند ثانیے کے بعد ہاشم بیگ صحن میں داخل ہوا اور انور علی کوئی جواب دینے کی بجائے بندوق پھینک کر رینگتا ہوا ایک طرف بڑھ کر منیرہ کی لاش کے ساتھ لپٹ

گیا۔ہاشم بیگ نے دریچے سے اندر جھانکنے کے بعد کمرے کے دروازے کو دھکا دیا اور دروازہ بند پا کر دریچے کے راستے کمرے کے اندر داخل ہوا۔

انور علی! اس نے جلدی سے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا۔میں تمہارے لیے جان بخشی کا وعدہ لے کر آیا ہوں۔

تم بہت دیر سے آئے ہو ہاشم! انور علی نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے جواب دیا۔اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔

ہاشم بیگ نے اسے لٹاتے ہوئے کہا۔میں انگریزی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔

انور علی نے کہا۔نہیں میں کسی انگریز کو اپنے زخموں پر ہاتھ رکھنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ہاشم میں تمہیں اس فتح کی مبارک دیتا ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ انگریز حیدر آباد کے سپاہیوں کو سرنگا پٹم کے مالِ غنیمت سے کوئی حصہ نہیں دیں گے۔تاہم میں تمہیں مایوس نہیں ہونے دوں گا۔

ہاشم بیگ ندامت، پریشانی اور کرب کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انور علی کو سہارا دیتے ہوئے اس کا ہاتھ خون سے تر ہو چکے تھے۔انور علی فرش پر رینگتا ہوا بستر کی طرف بڑھا۔اس نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور مخمل کی تھیلی نکال کر ہاشم بیگ کے پاؤں میں پھینک دی۔

ہاشم میرے دوست یہ تھیلی اٹھالو۔اس میں چند بیش قیمت ہیرے ہیں میں یہ نہیں چاہتا کہ یہ انعام جو میرے دادا نے سراج الدولہ کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ پیش کر کے حاصل کیا تھا کسی انگریز کے ہاتھ آجائے۔

ہاشم بیگ نے کرب انگیز لہجے میں کہا۔انور علی تم اس سے زیادہ تلخ باتیں کہنے کا حق رکھتے ہو۔حیدر آباد کی فوج کے سپاہی اس قتل و خون میں برابر کے حصہ دار ہیں

اور حیدر آباد کے مسلمانوں کی آئندہ نسلیں اس دن کی یاد میں قیامت تک آنسو بہائیں گی لیکن اس خون کے دھبے ان کے دامن سے نہیں دُھل سکیں گے۔اپنے متعلق میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس لڑائی میں غیر حاضر رہنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن تنویر کی یہ خواہش تھی کہ میں فوج کے ساتھ ضرور جاؤں۔اس کا خیال تھا کہ شاید میں خطرے کے وقت سرنگا پٹم کے کسی مسلمان کی جان بچا سکوں۔یہاں بھی فوج کے ان چند افسروں کے ساتھ تھا جنہوں نے لڑائی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ہمیں میر عالم نے ناقابل اعتماد سمجھ کر اپنے پڑاؤ سے نکلنے کی اجازت نہیں دی۔ ہمیں اس وقت شہر میں داخل ہونے کا موقع ملا جب جنگ ختم ہو چکی تھی میں رات کے وقت تمہارا گھر تلاش نہیں کر سکا۔صبح یہاں پہنچا تو حملہ ہو چکا تھا۔انگریز دیوار کی اوٹ سے گولیاں برسا رہے تھے۔میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے بندوق میری طرف سیدھی کر دی۔کسی افسر کی مدد لینے کے لیے نکلا تو اتفاق سے کرنل ولزلی اس طرف آرہا تھا۔

انور علی نے نقاہت سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔میرے دوست اگر میری باتوں سے تمہیں تکلیف ہوئی ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔

ہاشم بیگ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔انور علی مراد کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں۔

مُراد یہاں نہیں ہے۔وہ لڑائی سے پہلے افغانستان جا چکا تھا۔اگر وہ ملے تو اس کی حفاظت آپ کو سونپتا ہوں۔اگر میرے نوکروں کی کوئی مدد کر سکیں تو یہ ایک احسان ہو گا یہ میری بیوی ہے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ اس کی لاش پر کسی انگریز کی نگاہ پڑے۔اگر ہو سکے تو ہمیں اسی مکان کے کسی گوشے میں دفن کر دیجیے۔

انور علی کے چہرے پر موت کی زردگی چھا رہی تھی۔کمرے سے باہر بھاری

بوٹوں کی چاپ سُنائی دی۔اس نے نحیف آواز میں کہا۔ہاشم یہ تھیلی چھپا لو۔اب یہ مُراد کی امانت ہے۔اگر وہ تمھیں نہ ملے تو اسے شہباز کی چھوٹی بہن کے پاس پہنچا دینا۔مجھے یقین ہے کہ مُراد کسی دن ان کے ہاں ضرور جائے گا۔

ہاشم بیگ نے تھیلی اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ہاشم بیگ نے اُٹھ کر بستر سے چادر اٹھائی اور منیرہ کی لاش پر پردہ ڈالنے کے بعد آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔کرنل ولزلی اندر داخل ہوا اور باقی سپاہی ہاشم کے اشارے پر رُک گئے۔کرنل ولزلی نے ایک ثانیہ کے لیے انور علی کی طرف دیکھا اور پھر ہاشم بیگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔اگر آپ اس گھر کا تمام اسلحہ جمع کرنے کا ذمہ لیتے ہیں تو میرے آدمی یہاں سے چلے جائیں گے۔

ہاشم بیگ نے جواب دیا۔میں اس کا ذمہ لیتا ہوں۔لیکن آپ کو اسلحہ کی بجائے ان بھیڑیوں کو قابو میں رکھنے کی فکر کرنی چاہیے۔

کرنل ولزلی نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔اب بھیڑیوں کو قابو میں رکھنا اب میرے بس کی بات نہیں۔

وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

انور علی آنکھیں بند کیے اُکھڑے اُکھڑے سانس لے رہا تھا۔ہاشم دوبارہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔انور علی آنکھیں کھول کر پانی مانگا۔ہاشم بیگ نے کمرے کے کونے میں پڑی ہوئی صراحی سے پانی کا ایک کٹورا بھرا اور اس کی گردن کو ہاتھ کا سہارا دے کر کٹورا اس کے منھ کو لگا دے۔

پانی کا ایک گھونٹ پینے کے بعد انور علی نے ایک ہچکی لی اور اس کے منھ سے خون کے چند قطرے نکل کر پانی میں شامل ہو گئے۔ہاشم نے اس کا سر اپنے زانو پر

رکھ لیا۔ انور علی چند ثانیے بے حس و حرکت پڑا رہا۔

انور علی انور علی! ہاشم نے مضطرب ہو کر کہا۔

انور علی کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی رُوح سرنگا پٹم کے شہیدوں کی ارواح سے جا ملی۔



اگلے دن شام کے چار بجے کے قریب سرنگا پٹم کے قلعے سے سلطان شہید کا جنازہ نکلا۔ شہزادوں اور سلطنت کے عہدیداروں کے علاوہ گورا فوج کے چار کمپنیاں جنازے کے ساتھ تھیں۔ سلطان کے جاں نثاروں میں سے اکثر زخمی تھے آگے بڑھ بڑھ کر جنازے کو کندھا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ گزشتہ لوٹ مار اور قتل و غارت کے باعث اہلِ شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ گلیاں اور بازار سنسان نظر آتے تھے لیکن سلطان کی میت قلعے سے باہر نکلی تو سرنگا پٹم کے مرد و زن، بچے اور بوڑھے بلا امتیاز مذہب و ملت اپنی اپنی پناہ گاہوں سے نکل کر جنازے کے ساتھ شریک ہونے لگے۔ راستے کے گلی کوچوں میں لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ ان کا خوف و ہراس دُور ہو چکا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بدنصیب لوگ اپنے حکمران کی لاش کو بھی اپنا محافظ خیال کرتے ہیں۔ سرنگا پٹم کے بیٹے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور سرنگا پٹم کی بیٹیاں اپنے سر کے بال نوچ رہی تھیں۔

جنازہ اٹھا تو ہوا بند تھی اور گرمی کی شدت اور حبس کے باعث دم گھٹا جا رہا تھا۔ لوگ اُفق پر ایک خوفناک آندھی کے آثار دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد یہ تاریک آندھی سارے آسمان پر چھا گئی۔ جنازہ لال باغ میں پہنچا۔ شہر کے قاضی نے نمازِ جنازہ پڑھائے اور جب میت کو لحد میں اُتارا جا رہا تھا تو فضا میں چاروں طرف

بجلیوں کی مُہیب کڑک سُنائی دینے لگی۔ لوگوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ گورا فوج کو سلامی کا حکم دیا گیا لیکن ان کی بندوقوں کی آواز بادلوں کی خوفناک گرج میں دب کر رہ گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان پر جاہ وجلال کے اس پیکرِ مجسم کی روح کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

فضا کی تاریکی بڑھتی گئی اور بجلیوں اور چمک میں اضافہ ہوتا گیا۔ سرنگاپٹم کے درو دیوار ہل رہے تھے۔ وہ غدار جو انگریزی سنگینوں کے پہرے میں جنازے کے ساتھ آئے تھے سہمے جا رہے تھے۔ سُلطان کی تدفین سے فارغ ہونے کی دیر تھی آسمان پھٹ پڑا اور ان کی آن میں سرنگاپٹم کی گلیاں اور بازار ندیاں اور نالے نظر آنے لگے۔

کچھ دیر بعد میسور کی فوج کے چند افسر اور سپاہی دریائے کاویری کی طغیانی کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ایک بوڑھا افسر دھاڑیں مار مار کر کہہ رہا تھا۔ میں نے اپنی ساری عمر میں مئی کے پہلے ہفتے میں دریائے کاویری میں ایسا سیلاب نہیں دیکھا۔ میسور کے غدارو! کاش تم ایک دن اور صبر کر لیتے۔ قدرت ہماری مدد کرنا چاہتی تھی لیکن تم نے اسے موقع نہ دیا۔ آج اگر تم سرنگاپٹم کے تمام دروازے دشمن کے لیے کھول دیتے تو ہم ایک گولی ضائع کیے بغیر اس کے عزائم خاک میں ملا سکتے تھے۔

پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ میرے دوستو یہی دن تھا جس کا ہمارے سُلطان کو انتظار تھا۔ ہم کتنے بدقسمت ہیں آج جن بادلوں کو ہماری فتح کا مژدہ لے کر آنا تھا وہ ہمارے شکست خوردہ سپاہیوں کے آنسو دھو رہے ہیں۔

جنرل میڈوز، میجر بیٹسن اور ایلن نے اپنی تصانیف میں بجلیوں کے اس مہیب طوفان کے چشم دید حالات بیان کیے ہیں جس سے اس امر کی تصدیق ہوتی

ہے کہ شہر کے دوسرے حصوں کی طرح بمبئی کی انگریزی فوج کے کیمپ پر بھی بجلیاں گری تھیں جن سے دو آدمی ہلاک اور متعدد آدمی شدید مجروح ہوئے۔



انتیسواں باب

ایک شام مراد علی کے ساتھ آٹھ سوار دریائے کابل کے کنارے مہمند قبیلے کے ایک سردار کی بستی میں داخل ہوئے۔ آن کی آن میں بستی کے چند اادمی ان کے گرد جمع ہو گئے۔ مراد علی نے فارسی زبان میں کہا۔ ہم اس گاؤں کے سردار سے ملنا چاہتے ہیں۔

بستی کے لوگوں کے ہجوم سے ایک خوش وضع نوجوان آگے بڑھا اور اس نے کہا۔ آیئے!

مُراد علی اور اس کے ساتھی گھوڑوں سے اُتر پڑے اور نوجوان انہیں ساتھ لے کر ایک قلعہ نما مکان کی طرف چل دیا۔ راستے میں مُراد علی نے پوچھا۔ آپ اس گاؤں کے سردار ہیں؟ نہیں میں سردار کا پوتا ہاں۔ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

مراد علی نے جواب دیا۔ ہم میسور کے رہنے والے ہیں۔ لیکن اس وقت کابل سے آرہے ہیں۔ نوجوان نے کہا۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے میں نے اس سے پہلے میسور کا کوئی باشندہ نہیں دیکھا تھا، اس راستے ہندوستان کے جو مُسافر آتے جاتے ہیں وہ ہمیں سُلطان ٹیپو کے متعلق بڑی دلچسپ باتیں سنایا کرتے ہیں۔ آپ کابُل کیا لینے گئے تھے؟

ہم آپ کے حکمران کی خدمت میں ایک ضروری پیغام لے کر آئے تھے۔

اب آپ کہاں جارہے ہیں؟

اب ہم واپس جارہے ہیں۔ اور آج رات آپ کے مہمان ہیں۔

نوجوان نے جواب دیا۔ آپ کی خدمت ہمارے لیے راحت کا باعث ہو

گی۔

مکان کے احاطے سے باہر سردار کے آدمیوں نے ان کے گھوڑے پکڑ لیے اور نوجوان انہیں مہمان خانے میں لے گیا۔ مہمان خانے میں ایک وسیع کمرہ خوبصورت قالینوں سے آراستہ تھا۔ مُرادعلی اوراس کے ساتھی اپنے میزبان کے اشارے پر وہاں بیٹھ گئے نوجوان کا نام محمود خاں تھا اور مُرادعلی کو اس سے چند سوال پوچھنے کے بعد معلوم ہوا کہ گاؤں کا سردار کا نام مکرم خاں ہے اور محمود خاں اس کا سب سے چھوٹا پوتا ہے۔ اس کا باپ دو بڑے بھائی ایک چچا اوراس کے تین بیٹے زمان شاہ کی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ محمود خاں، مرادعلی کے ساتھ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد سردار کو اطلاع دینے کے لیے مکان کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔

چند منٹ بعد محمود خاں کے ساتھ ایک سفید ریش اور بلند قامت آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے کندھے پر ایک بھاری جبہ ڈالے ہوئے تھا۔ بڑھاپے کی باوجود وہ تندرست اور توانا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے السلام علیکم کہا اور مرادعلی اوراس کے ساتھی وعلیکم السلام کہہ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔ مکرم خاں نے یکے بعد دیگرے ان کیساتھ مصافحہ کیا اور ان کے درمیان ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

آپ میسور کے رہنے والے ہیں؟ اس نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

جی ہاں!

آپ کابل سے ہو کر آئے ہیں؟

جی ہاں!

زمان شاہ سے ملے تھے؟

جی ہاں۔ مُراد علی نے جواب دیا۔ ہم ان کی خدمت میں سلطان ٹیپو کی طرف سے ایک ضروری پیغام لے کر آئے تھے۔

بوڑھے سردار نے غور سے مراد علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ کو اپنی مہم میں کامیابی نہیں ہوئی۔

مُراد علی اور اس کے ساتھی پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

مکرم خاں مسکرایا۔ آپ کو میری باتوں سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے میسور کے حالات معلوم ہیں۔ اگر سلطان ٹیپو نے تم لوگوں کو ضروری پیغام دے کر زمان شاہ کے پاس بھیجا تھا تو میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ وہ پیغام کیا ہو سکتا ہے۔ میں لاہور کی طرف زمان شاہ کی پیش قدمی سے چند ماہ قبل کابل گیا تھا۔ میں وہاں ان کے وزیر وفادار خاں کا مہمان تھا۔ میں سلطان ٹیپو کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور جب میرے میزبان نے مجھے یہ بتایا کہ سُلطان کے سفیر ایک عرصے سے کابل میں مقیم ہیں تو میں نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ وفادار خان نے اگلے دن انہیں کھانے پر بُلایا۔ آپ کے سفیر میر حبیب اللہ اور ان کے ایک اور ساتھی میر رضا کے ساتھ میری پہلی ملاقات انتہائی دوستانہ تھی۔ وہ دیر تک سلطان ٹیپو کی شخصیت اور اس کے مجاہدانہ کارناموں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ پھر وفادار خان کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ وہ کس مقصد سے کابل تشریف لائے ہیں۔ اس کے بعد اگلے دن میں نے اعلیٰ حضرت زمان شاہ سے ملاقات کی۔ میں پانی پت کی جنگ میں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ تھا اور اس کے بعد تیمور شاہ کے ساتھ پنجاب کے سکھوں کے خلاف کئی معرکوں میں حصہ لے چکا ہوں۔ زمان شاہ میری بہت عزت کرتے ہیں۔ میں نے ان پر زور دیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اعانت آپ پر فرض ہے۔ سلطان

ٹیپو تن تنہا کئی برس سے انگریزوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اگر اسے شکست ہوگئی تو انگریز مرہٹوں کی نسبت کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔ اعلیٰ حضرت نے مجھے یقین دلایا کہ ہم ہندوستان پر چڑھائی کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

چند ماہ بعد اعلیٰ حضرت کی افواج لاہور کی طرف روانہ ہو چکی تھیں اور مجھے یقین تھا کہ اب عنقریب کسی میدان میں پانی پت کی تاریخ دُہرائی جائے گی اور میسور اور افغانستان کے سپاہی متحد ہو کر چند ماہ کے اندر اندر ہندوستان کو انگریزوں کے وجود سے پاک کر دیں گے۔ لیکن یہ مسلمانوں کی بدبختی تھی کہ افغانستان کی اندرونی سازشوں اور بیرونی خطرات نے زمان شاہ کو لاہور سے آگے بڑھنے کا موقع نہ دیا۔ جب وہ پشاور پہنچے تھے تو میں وہاں جا کر ان سے ملاقات کی تھی اور انہوں نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا تھا کہ افغانستان کے حالات ٹھیک ہوتے ہی میں دوبارہ دلی کا رُخ کروں گا۔

مُراد علی نے کہا۔ ہمارے کابل پہنچنے سے دو دن قبل وہ ہرات کی طرف پیش قدمی کر چکے تھے اور ہم نے کابل سے چند کوس آگے جا کر ان سے ملاقات کی تھی۔ انہوں نے ہمیں یہ اطمینان دلایا تھا کہ وہ ہرات کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد ہی سلطان کو کوئی تسلی بخش جواب دے سکیں گے۔

مکرم خاں نے کہا۔ میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اب افغانستان کے اپنے حالات بہت خراب ہو چکے ہیں گزشتہ ہفتے میں نے یہ افواہ سنی تھی کہ باغیوں نے قندھار پر قبضہ کر لیا ہے اور آج صبح پشاور سے یہ خبر آئی ہے کہ شجاع الملک نے اپنے بھائی کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔

مراد علی اور اس کے ساتھی رنج و کرب کی حالت میں کبھی بوڑھے سردار اور کبھی

ایکدوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔تھوڑی دیر بعد گاؤں کی مسجد سے مغرب کی اذان سنائی دی اور وہ سردار کے ساتھ باہر نکل آئے۔



رات کے وقت مکرم خاں کے دستر خوان پر مہمانوں کے علاوہ بستی کے چند معززین بھی موجود تھے۔پُر تکلف کھانا ایک افغان سردار کی روایتی مہمان نوازی کا آئینہ دار تھا۔کھانے کے بعد مہمانوں کی خاطر داری کے لیے گاؤں کے ایک گویے کو بُلایا گیا۔گویے نے اپنے سردار کی فرمائش پر دلکش لے میں پشتو کا ایک گیت چھیڑا۔ مُراد علی اور اس کے ساتھی پانی پت اور احمد شاہ ابدالی کے الفاظ کے سوا کچھ نہ سمجھ سکے۔لیکن بستی کے لوگوں پر رکت طاری ہو رہی تھی ۔کچھ دیر بعد گویا خاموش ہو گیا تو سردار نے کہا۔اب فارسی کی کوئی چیز سناؤ ہمارے مہمان پشتو نہیں جانتے۔پھر وہ مراد علی کی طرف متوجہ ہوا۔یہ احمد شاہ ابدالی اور پانی پت کی جنگ کے متعلق گا رہا تھا مجھے یہ راگ بہت پسند ہے۔

مراد علی نے کہا۔ہم اس کا راگ نہیں سمجھ سکے۔لیکن ہمارے لیے ایک افغان کے منھ سے پانی پت اور احمد شاہ ابدالی کے الفاظ سن لینا ہی کافی ہے۔ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیا گا رہا ہو گا۔پانی پت کے متعلق ہندوستان کے مسلمان بھی گایا کرتے ہیں۔

مکرم خاں نے کہا۔بیٹا جب پانی پت کی جنگ لڑی گئی تھی تو میری عمر پچیس سال تھی۔اس وقت میں یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ کسی دن احمد شاہ ابدالی اس دنیا میں نہیں ہو گا اور ہم اس کے متعلق صرف گیت سن کر اپنا جی بہلایا کریں گے۔وہ عجیب زمانہ تھا۔مرہٹوں کی فوج حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔لیکن ہم ایسا محسوس کرتے

تھے کہ اگر ہندوستان کی تمام زمین ان سے بھر جائے تو بھی ہم انہیں شکست دے سکتے ہیں۔ آفتاب دوبارہ ہندوستان کے کسی میدان میں مسلمانوں کا وہ جاہ و جلال نہیں دیکھے گا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ابھی کل کی بات ہے۔ شاہ ولی خاں، شاہ پسند خاں، برخوردار خاں، نصیر خاں، بلوچ، نجیب الدولہ، رحمت خاں روہیلہ اور مغل سرداروں کی صورتیں اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

حاضرین کی نگاہیں اب گویے سے ہٹ کر بوڑھے سردار کے چہرے پر مرکوز ہو چکی تھیں اور وہ پانی پت کی جنگ کے چشم دید حالات بیان کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ آخری معرکے سے پہلے پانی پت کے میدان میں بڑی دلچسپ باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ہماری فوج کے جوان گھوڑے دوڑاتے ہوئے مرہٹوں کے پڑاؤ کے قریب پہنچ جاتے اور مرہٹہ سورماؤں کو مقابلے کے لیے للکارتے۔ ایک جواب کسی مرہٹہ سردار کو موت کے گھاٹ اتار کر آتا تو اس کا انتقام لینے کے لیے ان کی طرف سے کوئی ہمارے پڑاؤ کے سامنے آکھڑا ہوا۔ میں نے ان مقابلوں میں تین مرہٹہ جوانوں کو موت کے گھاٹ اتار کر شاہ ولی خاں سے انعام حاصل کیا تھا۔ اس کی تلوار ابھی تک میرے پاس ہے۔

مُراد علی نے کہا۔ آپ کے ساتھ ایک اور جوان بھی تھا جو کبھی افغان، کبھی بلوچ، کبھی مغل اور کبھی روہیلہ سپاہی کا لباس پہن کر مرہٹوں کو للکارتا تھا۔

بوڑھے سردار نے چونک کر مراد علی کی طرف دیکھا۔ ہاں میں اس جوان کو کیسے بھول سکتا ہوں جس کے سر پر نصیر خاں بلوچ نے اپنا پٹکا اتار کر رکھ دیا تھا۔ اس نے کئی اور سرداروں سے بھی انعامات حاصل کیے تھے۔ ہم لوگ اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔

مُرادعلی نے کہا۔اس کا نام اکبر خاں تھا؟

ہاں لیکن تم اسے کیسے جانتے ہو؟

مرادعلی آبدیدہ ہوکر مسکرایا۔وہ میرے بات کے دوست تھے۔

مکرم خاں نے غور سے مرادعلی کی طرف دیکھا اور کہا۔تمہارے والد۔۔۔!

وہ پانی پت کی جنگ میں شریک تھے اور ایک ہزار روہیلہ سپاہی ان کی کمان میں تھے ان میں سے اکثر اکبر خاں کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

مکرم خاں کچھ دیر ایک سکتے کی سی حالت میں مُرادعلی کی طرف دیکھتا رہا۔پھر دونوں ہاتھ مرادعلی کے کندھوں پر رکھ کر بولا۔تم۔۔۔۔ تم معظم علی کے بیٹے ہو؟

جی ہاں اور ان کے الفاظ کے ساتھ مُرادعلی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

مکرم خاں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔تم بالکل وہی ہو۔مجھے تمہیں دیکھتے ہی یہ محسوس ہوا تھا کہ ایسی صورت میں نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔تم اس مجاہد کے بیٹے ہو جسے احمد شاہ ابدلی نے اپنے کپڑے پہنائے تھے۔میں ہمیشہ اسے اکبر خاں کے ساتھ دیکھا کرتا تھا۔میں نے دلی کی مسجد میں اس کی تقریر سُنی تھی۔آج چالیس سال بعد میرے گھر اس مجاہد کا بیٹا آیا ہے جس کی صورت دیکھ کر ہمارا ایمان تازہ ہو جاتا تھا اور میں اسے پہچان نہ سکا۔

بوڑھے سردار کی آواز بیٹھ گئی اور وہ اپنا منہ آستین میں چھپا کر سسکیاں لینے لگا۔حاضرین مجلس پر رقت طاری ہو چکی تھی۔کچھ دیر مکرم خاں نے اپنے آنسو پونچھے اور مرادعلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔تمہارا باپ زندہ ہے؟

جی نہیں۔وہ میسور میں انگریزوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔

اور اکبر خاں؟

انہیں مرہٹوں نے شہید کر دیا تھا۔

مکرم خاں کے چند سوالات کے جواب میں مراد علی نے مختصراً اپنے اور اکبر خاں کے خاندان کی سرگزشت بیان کر دی۔ جب روہیل کھنڈ سے اکبر خاں کے قبیلے کی ہجرت کا ذکر آیا تو مکرم خاں نے کہا۔ روہیل کھنڈ سے جو لوگ ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ ان کے چند خاندان یہاں سے شمال کی طرف چند کوس دُور آباد ہیں لیکن مجھے معلوم نہیں کہ ان میں کوئی اکبر خاں کا عزیز بھی ہے یا نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں ان کے سرکردہ آدمیوں سے آپ کی ملاقات کا انتظام کر سکتا ہوں۔ نہیں۔ میں اب فوراً سرنگا پٹم واپس پہنچنا چاہتا ہوں۔ خدا معلوم وہاں کیا ہو رہا ہے۔

مکرم خاں مُراد علی کے ساتھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اب ان کی گفتگو کا موضوع انگریزوں، مرہٹوں اور میر نظام علی کے خلاف سُلطان ٹیپو کی جنگیں تھیں۔ آدھی رات کے قریب یہ مجلس برخاست ہوئی۔ سردار اٹھ کر جانے لگا تو حاضرین احترام سے کھڑے ہو گئے۔ سردار نے کمرے سے نکلتے وقت مراد علی کی طرف دیکھا اور گلے لگاتے ہوئے کہا۔ میرے عزیز تم اس گھر میں مہمان نہیں ہو تیں تھیں اپنا بیٹا سمجھتا ہوں۔ اب آرام کرو۔

اگلے دن مکرم خاں بستی سے ایک میل دور جا کر مراد علی اور اس کے ساتھیوں کو الوداع کہہ رہا تھا۔ پشاور میں بغاوت کے باعث راستے کے مخدوش حالات کے پیشِ نظر مکرم خاں کے قبیلے کے بیس مسلح آدمی ان کے ساتھ جا رہے تھے۔ مراد علی کے ساتھ مصافحہ کرتے وقت بوڑھے سردار کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے۔ بیٹا میری زندگی میں شاید تم دوبارہ ادھر نہ آسکو لیکن یہ یاد رکھو کہ میرے گھر کا دروازہ

تمہارے لیے ہمیشہ کھلا رہے گا۔اگر میں نہ ہوا تو بھی میرے خاندان کے بچے اور جواب تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔

پھر وہ محمود خاں کی طرف متوجہ ہوا۔بیٹا تم کو انہیں اٹک کے پار پہنچا کر واپس آنا ہے



سلطان کی شہادت سے چھ دن بعد شہزادہ فتح حیدر نے جنزل ہیرس کے وعدوں اور قمر الدین، پورنیا اور میر غلام علی ے مشورں سے متاثر ہو کر ہتھیار پھینک دیے۔میسور کے حریت پسندوں کی رگوں میں ابھی تک خون کے چند قطرے باقی تھے اور وہ آخری وقت تک شہزادہ فتح حیدر کو جنگ جاری رکھنے کا مشورہ دیتے رہے۔ ملک جہاں خاں سرنگا پٹم سے فرار ہونے کے بعد ان حریت پسندوں کا رہنما بن چکا تھا۔اس نے شہزادہ فتح حیدر کو یہ سمجھانے کی کوشش کی آپ کو کسی تاخیر کے بغیر چتل ڈرگ پہنچ جانا چاہیے۔وہاں چند دن کے اندر اندر سلطانِ شہید کے ہزاروں جاں نثار جمع ہو جائیں گے اور یہ لوگ آخری وقت تک آپ کا ساتھ دیں گے۔میسور کے شہیدوں کا خون رائیگاں نہیں جا سکتا۔سرنگا پٹم کے ہندوؤں اور مسلمانوں پر انگریزوں نے جو مظالم توڑے ہیں۔ان کے بعد ان سے کسی انسانی سلوک کی توقع رکھنا پرلے درجے کی خود فریبی ہے۔آپ ان وطن فروشوں کے مشوروں پر یقین نہ کریں جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے سرنگا پٹم پر انگریزوں کے پرچم نصب کے ہیں۔ان غداروں کو ہمیشہ اس بات کا خوف رہے گا کہ سلطان کے جاں نثار انہیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔میر قمر الدین، پورنیا اور ان کے ساتھیوں کی آخری کوشش یہ ہوگی کہ میسور سے آپ کے خاندان کا اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

یہ درست ہے کہ ان حالات میں ہم ایک لامتناہی عرصہ کے لیے دوشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ سرنگا پٹم پر انگریزوں کے مظالم ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہیں گے۔ اگر ہم چند ہفتے یا چند مہینے لڑتے رہیں گے تو ہماری جنگ صرف میسور ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان کی آزادی کی جنگ بن جائے گی۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس ملک کے تمام حکمران میر نظام علی کی طرح بے ضمیر ثابت نہیں ہوں گے۔ اب ان پر انگریزوں کی جارحانہ عزائم بے نقاب ہو چکے ہیں اور سرنگا پٹم کے واقعات کے بعد وہ اپنی بقا کے لیے ہمارا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس جنگ میں پیشوا اور مرہٹہ سرداروں کا طرزِ عمل یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ انہیں اپنی سابقہ غلطیوں کا احساس ہو چکا ہے۔

سلطانِ شہید نے انگریزوں کے خلاف ہندوستان، افغانستان اور ایران کے جس اتحاد کا خواب دیکھا تھا وہ کسی دن ضرور پورا ہو گا۔ ممکن ہے ہندوستان پر زمان شاہ کی چڑھائی اس ملک کی سیاست کا نقشہ بدل دے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گا اور اس ملک کے بیشتر حکمران اسے اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے اور جو اس کا ساتھ نہیں دیں گے انہیں وطن کی عزت اور آزادی کا دشمن سمجھ کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا سُلطان شہید کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی اور اُن کی یہ خواہش پوری ہو کر رہے گی۔

لیکن شہزادہ فتح حیدر کو ملک جہان خاں اور اس کے ساتھیوں کی التجائیں متاثر نہ کر سکیں۔ اس کے بھائی اور خاندان کے باقی تمام افراد سرنگا پٹم میں انگریزوں کے

رحم و کرم پر تھے۔فوج کے بہت کم سپاہی اور افسر ایسے تھے جو اپنے اندر گرتی ہوئی دیواروں کی پناہ لے کر جنگ جاری رکھنے کا حوصلہ پاتے تھے۔سلطان کی شہادت اور سرنگا پٹم کے سقوط نے انہیں بد دل اور مایوس کر دیا تھا اور ان میں سے کئی ایسے تھے جن کے بال بچے سرنگا پٹم میں تھے۔

شہزادہ فتح حیدر کو جنرل ہیرس کے وعدوں کے باوجود انگریزوں سے کسی نیک سلوک کی توقع نہ تھی۔اسے ان ملت فروشوں کے متعلق بھی کوئی خوش فہمی نہ تھی جو انگریزوں کے وکیل بن کر اسے اپنے خاندان کے مستقبل کے متعلق سبز باغ دکھا رہے تھے۔اس کے نزدیک سلطان کی شہادت کے بعد میسور کی آزدی کا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور وہ ایک بہادر سپاہی ہونے کے باوجود رات کی تاریکیوں میں ایک لٹے ہوئے قافلے کی رہنمائی کے لیے تیار نہ تھا۔

جب شہزادہ فتح حیدر انگریزوں کی اطاعت قبول کرنے کے لیے سرنگا پٹم کا رُخ کر رہا تھا تو ملک جہاں خاں گجل ہٹی کی ایک پہاڑی کے دامن میں چند سر پھروں کے سامنے یہ تقریر کر رہا تھا۔

شہزادے نے میرا کہا نہیں مانا اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ حالات نے اُسے بے بس و مجبور بنا دیا ہے۔لیکن میں سلطان شہید کے مقدس خون کی قسم کھا کر یہ اعلان کرتا ہوں کہ جب تک میری رگوں میں خون کا ایک قطرہ باقی ہے میں میسور کی عزت اور آزادی کے دشمنوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دوں گا۔میں ان غداروں کو کبھی معاف نہیں کروں گا جنھوں نے میرے قوم کو یہ دن دکھایا ہے۔ان حالات میں میں تم سے کسی شاندار فتح کا وعدہ نہیں کر سکتا۔لیکن میں تمھارے ساتھ ایک وعدہ کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ انگریز اور انکے حلیف تمھارے ہاتھوں میں غلامی کی زنجیریں نہیں پہنا

سکیں گے۔ آزادی کی زندگی سے مایوس ہونے کے بعد ایک مسلمان جس چیز کی تمنا کرسکتا ہے وہ عزت کی موت ہے اور جو لوگ عزت کی موت کے لیے میرا ساتھ دینا چاہتے ہیں انہیں مایوس نہیں کروں گا۔

تھوڑی دیر بعد ملک جہان خاں کی رہنمائی میں ڈیڑھ سو سوار کسی نامعلوم منزل کا رُخ کر رہے تھے۔

شہزادہ فتح حیدر کے ہتھیار ڈالنے کے بعد میسور کی وہ داستان جس کے حسین عنوان حیدر علی اور سلطان ٹیپو نے اپنی تلواروں کی نوک سے لکھے تھے، ختم ہوچکی تھی۔ سرا اور چتل ڈرگ کے کمانڈر بھی میسور کے مستقبل سے مایوس ہوکر ہتھیار ڈال چکے تھے۔ اب سلطنت خداداد ایک لاش تھی جسے انگریز گدھوں کی طرح نوچ رہے تھے۔ ولزلی نے مالِ غنیمت کے چند ٹکڑے نظام کے آگے ڈال دیے اور ساحل کے تمام اضلاع اور کوئمبٹور کے علاوہ سرنگا پٹم کا جزیرہ اپنے قبضے میں لے لیا۔

سلطنتِ خداداد کی بندر بانٹ کے بعد انگریزوں نے سابق ہندو راجہ کے خاندان سے ایک پانچ سالہ بچہ تلاش کیا اور اسے تخت پر بٹھا دیا۔ نیا راجہ ہندوستان کی بساطِ ریاست پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا سب سے بے بس اور حقیر مہرہ تھا۔ اس کی ریاست میسور کے چند وسطی اضلاع تک محدود تھی۔ غداری کے صلے میں پورنیا کو نئے راجہ کا دیوان مقرر کیا گیا۔ میر قمر الدین کو گرم کنڈہ کی جاگیر عطا کی گئی اور میر معین الدین کے جانشینوں اور دوسرے غداروں کو بھی ان کی سابقہ مراتب کے لحاظ سے جاگیروں دی گئیں۔ شہزادوں کو جلاوطن کر کے ولور بھیج دیا گیا۔ اب انگریز پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم نے اہلِ میسور کی کتابِ زندگی سے آزادی کا لفظ خارج کر دیا ہے۔

لیکن میسور کی راکھ میں ابھی تک چند چنگاریاں سُلگ رہی تھیں ۔ چنانچہ نئے راجہ کی تاجپوشی کے دو دن بعد جنرل ہیرس لارڈ ولزلی کو یہ خط لکھ رہا تھا کہ ہمارے خلاف ملک جہاں خاں کی

اے ۔میر نظام علی کی مربھر کی ملت فروشی کا یہ سلہ اس کے ساتھ ایک مذاق تھا۔ نظام کو گوٹی چتل ڈرگ کا کچھ حصہ دیا گیا۔ انگریزوں نے سب سڈیری سسٹم قبول کرنے کی شرط پر مرہٹوں کو تنگ بھدرہ کے شمال میں چند علاقے پیش کیے لیکن مرہٹوں کے پیشوا نے ان کی یہ پیش کش ٹھکرا دی اور یہ علاقے بھی ایسٹ انڈیا اور حیدر آباد کی حکومتوں نے آپس میں تقسیم کر لیے لیکن میر نظام علی کے لے ذلت کے یہ ٹکڑے حاصل کرنے کی خوشی بھی عارضی ثابت ہوئی ۱۸۰۰ء کے آغاز میں لارڈ ولزلی کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے یہ تمام علاقے ایسٹ انڈیا کمپنی کو واپس کر دیے۔

کاروائیں اب باقاعدہ ایک جنگ کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہیں ۔آج یہ اطلاع آئی ہے کہ اس نے چتل ڈرگ کے مغرب میں ہماری ایک چوکی پر حملہ کر کے ہمارے پچاس آدمی موت کے گھاٹ اُتار دیے ہیں ۔پچھلے ہفتے انہوں نے حیدر آباد کی سرحد پر میر نظام علی کے چند دستوں کا صفایا کر دیا تھا۔ ہماری اطلاعات کے مُطابق ملک جہاں خاں کے ساتھ پانچ ہزار باغی جمع ہو چکے ہیں اور ان کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

تیسواں باب

ایک دوپہر بلقیس اپنے مکان کے صحن میں ایک درخت کے نیچے لیٹی ہوئی تھی۔ثمینہ ایک کمرے سے نکلی اور بلقیس کی کھاٹ کے پاس ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔فضا میں حبس تھا۔بلقیس نے پنکھے سے اپنے چہرے کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔آج ہوا بالکل بند ہے،بارش ضرور آئے گی۔

ثمینہ کچھ کہے بغیر ماں کے ہاتھ سے پنکھا پکڑ کر اسے جھلنے لگی۔

ایک نوکر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا صحن میں داخل ہوا اور اس نے بلقیس کی طرف ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے کہا۔بی بی جی۔ہاشم بیگ صاحب کا آدمی آگیا ہے اور اس نے یہ خط دیا ہے۔اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ میں مُراد علی کا نوکر ہوں۔

بلقیس نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ پکڑ لیا اور نوکر واپس چلا گیا۔

ثمینہ کا دل دھڑک رہا تھا اور وہ انتہائی بے چینی کی حالت میں اپنی ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔بلقیس نے خط کھولے بغیر ثمینہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔بیٹی مجھے پڑھ کر سُناؤ۔

ثمینہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط کھولا اور پڑھ کر سنانے لگی۔ہاشم بیگ نے لکھا تھا۔

خالہ جان! السلامُ علیکم۔مجھے افسوس ہے کہ مُراد علی کو آپ کا پیغام نہیں پہنچ سکا۔وہ آپ کا خط موصول ہونے سے چار دن قبل رات کے وقت اپنے گھر پہنچا تھا اور تھوڑی دیر بعد شہر میں اپنے کسی دوست کا حال معلوم کرنے کے لیے چلا گیا تھا۔اس کے بعد وہ ابھی تک واپس گھر نہیں آیا۔

علی الصباح اس کے نوکر نے مجھے یہ اطلاع دی تو میں نے سرنگا پٹم کا کونا کونا چھان مارا۔ اس کے نوکر کہتے ہیں کہ اپنے بھائی اور اس کی بیوی کی موت کے واقعات سُننے کے بعد اس نے ان کی قبریں دیکھیں۔ پھر کسی سے بات کیے بغیر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ایک نوکر نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اور اس نے جواب دیا کہ میں ایک دوست کا حال معلوم کرنے جا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ رات کے وقت سرنگا پٹم میں نہیں ٹھہرا۔ ممکن ہے کہ میرے خط سے قبل وہ آپ کے پاس پہنچ چکا ہو۔

مجھے سرنگا پٹم سے ادھونی پہنچنے کا حکم مل چکا ہے اور میں اسی ہفتے یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ ممکن ہے کہ میری فوج کو مستقل طور پر وہیں روک لیا جائے۔ مُراد علی کے نوکروں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ ایک نوکر میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے اور دوسرا آپ کے پاس بھیج رہا ہوں اور باقی سرنگا پٹم چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔

اگر مراد علی آپ کے پاس پہنچ چکا ہو تو اسے میرا سلام پہنچا دیں۔ اس زخموں کا مداوا اب کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ ل اگر وہ آپ کے پاس نہیں پہنچا تو میں اس کی تلاش جاری رکھوں گا۔ مجھے صرف ایک بات کا خطرہ ہے کہیں وہ باغیوں کے ساتھ نہ مل گیا ہو۔ اس صورت میں اس کی مدد کرنا میرے لیے بہت مشکل ہو جائے گا۔ ثمینہ کو سلام۔

خط کے اختتام پر ثمینہ کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ وہ ضرور آئیں گے امی جان انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ ممکن ہے کہ انگریزوں نے انہیں گھر سے نکلتے ہی گرفتار کر لیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گرفتاری کا خطرہ محسوس کر کے کہیں چھپ گئے ہوں اور ان کے نوکروں نے بھائی

جان کونا قابلِ اعتماد سمجھ کران کا پتہ نہ دیا ہو۔آپ ان کے نوکر کو اندر بلا کر پوچھیں۔

بلقیس نے کہا۔اچھی بیٹی خادمہ سے کہو اس کو بُلا لائے۔

ثمینہ اُٹھ کر خادمہ کو آوازدیں دیتی ہوئی باروچی خانے کی طرف بڑھی۔

خادمہ نے باورچی خانے کے دروازے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔کیا بات ہے بی بی جی؟

ثمینہ نے کہا۔تم باہر جاؤ اور نوکروں سے کہو سرنگا پٹم سے مُراد علی کا جو نوکر آیا ہے اسے اندر بھیج دو۔

خادمہ چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد منور خاں صحن میں داخل ہوا۔بلقیس اور ثمینہ کو سلام کرنے کے بعد وہ مودب کھڑا ہو گیا۔ثمینہ نے اُٹھ کر اپنا مونڈھا ذرا آگے کر دیا اور خود ماں کے ساتھ کھاٹ پر بیٹھ گئی۔

بیٹھ جاؤ۔بلقیس نے مونڈھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور منور خاں ہچکچاتا ہوا مونڈھے پر بیٹھ گیا۔بلقیس اور اس کے بعد ثمینہ کے متعدد سوالات کے جواب میں اس نے سرنگاپٹم کے تمام واقعات بیان کر دیے۔اپنی سرگزشت کا آخری حصہ سناتے وقت اس کی قوت گویائی جواب دے چکی تھی اور وہ بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔جب بلقیس نے مراد علی کے متعلق پوچھا تو اس نے انتہائی کرب کی حالت میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔وہ کہہ رہا تھا۔بی بی جی میرا خیال تھا کہ وہ آپ کے پاس پہنچ چکے ہوں گے لیکن آپ کے نوکر کہتے ہیں کہ وہ یہاں نہیں آئے۔جب وہ گھر سے نکل رہے تھے تو میں نے ان کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی تھی۔میں نے پوچھا۔آپ کہاں جا رہے ہیں؟ تو کہتے تھے مجھے معلوم نہیں۔میں

نے ان کے ساتھ جانے کی ضد کی تو انہوں نے کہا اب تم لوگ میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ میں اور کریم خاں ڈیوڑھی تک ان کے ساتھ آئے۔ آخری بات جو انہوں نے ہماری تلسی کیلئے کہی تھی وہ یہ تھی کہ میں کسی دوست کا حال معلوم کرنے جا رہا ہوں۔ اس کے بعد ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں گئے۔ ہم سرنگا پٹم کا کونا کونا چھان چکے ہیں۔ لیکن شہر میں ان کے کسی دوست کو ان کا حال معلوم نہیں۔ مرزا ہاشم بیگ صاحب نے بھی انہیں تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ وہ سیدھے آپ کے پاس پہنچ چکے ہوں گے۔ بی بی جی اگر آپ کو ان کے متعلق کچھ معلوم ہو تو خدا کے لیے مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کیجیے۔

منور خاں کی آنکھیں دوبارہ آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔ بلقیس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ بیٹا تمہیں حوصلہ سے کام لینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ مُراد علی یہاں ضرور آئے گا۔ میں ہاشم کا پیغام بھیجوں گی کہ اس کی تلاش جاری رکھے اور میں یہ چاہتی ہوں کہ جب تک مُراد علی کا پتہ نہیں چلتا تم ہمارے پاس رہو۔



پانچ مہینے اور گزر گئے لیکن مراد علی کا کوئی سراغ نہ ملا۔

اس عرصہ میں انگریزوں کے خلاف ملک جہاں خاں کی سرگرمیاں ایک باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کرچکی تھیں۔ کبھی اس کے متعلق یہ اطلاع آتی کہ اس نے میسور کے فلاں علاقے پر اچانک حملہ کر کے انگریزوں کی چند چوکیوں کا صفایا کر دیا ہے اور کبھی یہ سُنا جاتا ہے کہ انگریزی فوج نے باغیوں کو شکست دے کر مرہٹہ علاقوں کی طرف سے ہٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ پھر کچھ عرصہ بعد یہ اطلاع آئی کہ ملک جہاں خاں کا لشکر مرہٹوں کے علاقے سے نکل کر مملکتِ نظام کی حدود میں داخل ہو

چکا ہے۔

ملک جہان خاں کے ساتھیوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا۔ میسور کے حریت پسند اسے اپنی آخری اُمید سمجھ کر جوق در جوق اس کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے تھے اور بعض وہ مرہٹہ سردار بھی جنہیں سرنگا پٹم کی تسخیر کے بعد اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ سلطنتِ خداداد کے خاتمے کے بعد انگریزوں کی تلوار ان کی اپنی شہ رگ تک پہنچ چکی ہے۔ در پردہ **ملک جہان خاں** کی اعانت کر رہے تھے۔ میسور کی شمال اور مغربی سرحدوں پر بعض دُشوار گزار پہاڑ اور جنگل ان باغیوں کے لیے ناقابلِ تسخیر قلعوں کا کام دے رہے تھے۔ جب ایک مقام پر انگریزوں کا گھیرا تنگ ہونے لگتا تو یہ لوگ ایک حیرت انگیز رفتار کے ساتھ کوسوں دور کسی اور جگہ جا نکلتے۔ مقامی باشندوں کے عدم تعاون کے باعث انگریزوں کے لیے باغیوں کی نقل و حرکت معلوم کرنا مشکل تھا۔ رسد اور اسلحہ حاصل کرنے کے لیے باغیوں کو ہر جگہ مقامی لوگوں کا تعاون حاصل تھا۔

حیدر آبادی اور انگریزی سپاہیوں کی طرح **ملک جہان خاں** اُن مرہٹہ سرداروں کو بھی ناقابلِ معافی سمجھتا تھا۔ جنھوں نے میسور کے خلاف سابقہ جنگوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ چنانچہ پرس رام بھاؤ کے بعض چیدہ چیدہ ساتھی قتل ہو چکے تھے اور بعض سرحدی علاقوں کو اپنے لیے غیر محفوظ سمجھ کر راہِ فرار اختیار کر چکے تھے۔ میسور کی جن غداروں نے ملت فروشی کے عوض انگریزوں سے بڑی بڑی جاگیریں حاصل کی تھیں ان پر **ملک جہان خاں** کی مصیبت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے گھروں سے باہر جھانکنے میں بھی خطرہ محسوس کرتے تھے۔

ثمنہ کی زندگی کی تمام دلچسپیاں اب مُراد علی کے انتظار تک محدود ہو چکی تھیں۔

ایک شام وہ مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد مکان کی چھت پر کھڑی تھی۔ مغرب کے اُفق پر پہلی ارت کا چاند نمودار ہو چکا تھا۔ ثمینہ نے دُوا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اس کی نگاہوں کے سامنے آنسوؤں کے پردے حائل ہونے لگے۔

خادمہ سیڑھی سے نمودار ہوئی اور وہ ثمینہ کو دُعا میں مصروف دیکھ کر چند قدم دُور رُک گئی۔ ثمینہ نے دُعا ختم کی اور اس نے کہا۔ بی بی جی آپ کے بہنوئی تشریف لائے ہیں۔

ثمینہ نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ اکیلے آئے ہیں؟

جی نہیں ان کیساتھ نوکر بھی ہے۔

ثمینہ نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔ وہ مراد علی کے متعلق کوئی خبر لائے ہیں؟

جی نہیں۔ ثمینہ کے دل کی دھڑکنیں اچانک خاموش ہو گئیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی زینے کی طرف بڑھی اور نیچے اترنے لگی۔ مکانکے ایک کمرے سے اس کی ماں اور ہاشم بیگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھی لیکن دروازے کے قریب پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ ہاشم بیگ کہہ رہا تھا۔ خالہ جان! اب اس کا خیال چھوڑ دیجیے۔ اب وہ واپس نہیں آ سکتا۔ اس ملک کی زمین اس کے لیے تنگ ہو چکی ہے، وہ مُراد جسے تم اپنا بیٹا سمجھتی تھی مر چکا ہے۔

بلقیس کی آواز آئی۔ نہیں بیٹا خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کہو۔

خالہ جان! میں اس کے متعلق کم پریشان نہیں ہوں۔ لیکن وہ ایک ایسے گروہ میں شامل ہو چکا ہے جس کی جدوجہد کا انجام مجھے تباہی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ مجھے افسوس ہے کہ سرنگا پٹم میں اس کے ساتھ میری ملاقات نہیں ہو سکی۔ ورنہ میں اسے

ملک جہاں خاں کا ساتھی بننے سے روک لیتا۔

لیکن بیٹا تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ وہ ملک جہاں خاں کے ساتھ شامل ہو چکا ہے؟

خالہ جان پچھلے دنوں انگریزوں نے اعلان کیا تھا کہ جو باغی ملک جہاں خاں کا ساتھ چھوڑ کر واپس آ جائیں گے انہیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی اور بعض آدمی جو اس کا ساتھ چھوڑ کر سرنگا پٹم واپس آ گئے ہیں۔ میں ان سے مل چکا ہوں۔ انہوں نے یہ بتایا ہے کہ باغیوں کا لشکر ملک جہان خاں کے بعد مراد علی کو اپنا سب سے زیادہ ذہین اور قابلِ اعتماد افسر خیال کرتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مراد علی کسی قیمت پر ملک جہاں خاں کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو گا۔ اسے اب زندگی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

ثمینہ کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی وہ اچانک کمرے میں داخل ہوئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہاشم بیگ کی طرف دیکھنے لگی۔

ہاشم بیگ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ بیٹھ جاؤ ثمینہ! مجھے افسوس ہے کہ میں مراد علی کے متعلق کوئی تسلی بخش خبر نہیں لایا۔

ثمینہ نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ امی جان وہ ضرور آئیں گے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتے کاش میں ان کے پاس جا سکتی!

ان الفاظ کے ساتھ ثمینہ کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور وہ سسکیاں لیتی ہوئی برابر کے کمرے میں چلی گئی۔

ہاشم بیگ اور اضطراب کی حالت میں کچھ دیر بلقیس کی طرف دیکھتا رہا۔

بالآخر اس نے کہا۔ خالہ جان مجھے معلوم نہ تھا کہ ثمینہ ۔۔۔۔۔۔۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے۔

بلقیس نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ بیٹا ثمینہ بدل چکی ہے۔

ہاشم نے کرسی سے اُٹھ کر برابر کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ خالہ جان میں پتھر کے موم ہو جانے کا یقین کر سکتا ہوں ثمینہ کی آنکھوں میں آنسو کا تصور نہیں کر سکتا۔ میں ابھی آتا ہوں۔

وہ برابر کے کمرے میں داخل ہوا۔ ثمینہ منہ کے بل بستر پر پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس نے جھک کر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ثمینہ! میری ننھی بہن! حوصلے سے کام لو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں خود اس کے پاس جاؤں گا میں اسے یہ کہوں گا کہ ہماری ننھی ثمینہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

ثمینہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور ملتجی نگاہوں سے ہاشم کی طرف دیکھنے لگی۔

ہاشم نے کہا۔ ثمینہ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس بیوقوف نے تمہیں اس قدر پریشان کیا ہے۔

ثمینہ نے گردن جھکا لی۔ ہاشم بیگ نے اپنی قبا کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مخمل کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی اور دوسرا ہاتھ ثمینہ کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ثمینہ یہ لو۔ یہ مُراد علی کی امانت ہے اور مجھے یقین ہے کہ اُس کے آنے تک تم اس کی حفاظت کر سکو گی۔

ثمینہ مذبذب سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

ہاشم بیگ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی ہتھیلی میں جواہرات کی تھیلی رکھ کر کچھ کہے بغیر بلقیس کے کمرے میں چلا گیا۔

خالہ جان میں صبح ہوتے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔

کہاں؟

میں مُراد علی کی تلاش میں جا رہا ہوں خالہ جان!



بیس دن بعد ایک دوپہر ہاشم بیگ ایک دشوار گزار پہاڑی علاقے میں سرف کر رہا تھا۔ایک پہاڑ کے دامن میں گھنا جنگل عبور کرنے کے بعد اس نے ایک ندی کے کنارے رُک کر اپنے گھوڑے کو پانی پلایا۔پھر نیچے اُتر کر اپنی پیاس بجھائی۔اس کے بعد اپنی جیب سے ایک نقشہ کھولا اور ندی کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ کر دیکھنے لگا۔چند منٹ بعد اس نے نقشہ لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا اور اُٹھ کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ندی عبور کرنے کے بعد اس نے دوسرے کنارے ایک درخت کے قریب رُک کر اپنی تلوار نکالی اور ایک جھکے ہوئے درخت کی چند شاخیں کاٹنے کے بعد ندی کے ساتھ ساتھ بائیں طرف چل دیا۔کوئی آدھ میل چلنے کے بعد اس ندی میں ایک اور ندی آملی اور ہاشم بیگ دائیں ہاتھ مُڑ کر دوسری ندی کے کنارے ہو لیا۔اچانک اسے گھنے درختوں میں کوئی آہٹ محسوس ہوئی اور اس نے گھوڑا روک لیا۔

درختوں سے ایک آدمی اس کی طرف بندوق سیدھی کیے نمودار ہوا اور اس نے کسی توقف کے بغیر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔تم کون ہو؟

ہاشم بیگ نے اطمینان سے جواب دیا۔اگر تم ملک جہان خاں کے آدمی ہو تو مجھے ان کے پاس لے چلو۔

تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ملک جہان خاں یہاں رہتے ہیں۔اجنبی نے یہ کہہ کر آگے بڑھتے ہوئے بندوق کی نالی ہاشم بیگ کے منہ کے آگے کر دی۔

ہاشم بیگ نے قدرے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے اپنے آگے پیچھے اور دائیں طرف چند مسلح آدمی دکھائی دیے۔ اجنبی نے کہا۔ تم گھوڑے سے اُترو اور اپنی تلوار اور بندوق ہمارے حوالے کر دو۔

ہاشم بیگ نے کسی پس وپیش کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی اور کہا۔ تم لوگوں کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ میں یہاں تک پہنچنے کے بعد بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے ملک جہان خاں کے پاس لے چلو۔

اتنی دیر میں دس آدمی ہاشم بیگ کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان نے کہا۔ تم دوسری ندی کے پار کوئی نقشہ دیکھ رہے تھے؟

ہاں!

لاؤ وہ نقشہ بھی ہمارے حوالے کر دو۔

ہاشم بیگ نے اپنی جیب سے نقشہ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ نوجوان نے نقشہ کھول کر اپنے ساتھیوں کو دکھایا اور پھر ہاشم بیگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا تمہیں معلوم ہے کہ ملک جہان خاں انگریزوں کے جاسوسوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟

مجھے معلوم ہے۔ ہاشم بیگ نے جواب دیا۔ میں یہاں سے دو تین میل دور ایک درخت پر لٹکی ہوئی پانچ لاشیں دیکھ چکا ہوں۔ لیکن میں جاسوس نہیں ہوں۔

یہ نقشہ تمہیں کس نے دیا؟

ہاشم بیگ نے کہا۔ دیکھو میں ملک جہان خاں سے ملنا چاہتا ہوں اور میں تمہیں یہ یقین دلاتا ہوں کہ ان کے ساتھ میری ملاقات کے بعد تمہیں ایسے سوالات پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

نوجوان نے دو عمر رسیدہ آدمیوں کو ایک طرف لے جا کر ان کے ساتھ کچھ دیر باتیں کیں اور پھر ہاشم بیگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ہم تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ کر ملک جہان خاں کے پاس لے چلیں گے۔

ہاشم بیگ نے جواب دیا۔ اگر یہ ضروری ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہاشم بیگ آنکھوں پر پٹی بندھوا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور ایک آدمی نے باگ پکڑ لی۔

راستے میں ان لوگوں نے ہاشم بیگ سے کوئی بات نہ کی۔ وہ گھوڑے کی زین پر سے صرف یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ ایک جنگل کے ناہموار اور دشوار گزار راستے سے گزر رہا ہے۔ کوئی تین گھنٹے سفر کرنے کے بعد یہ لوگ رُک گئے اور کسی نے ہاشم بیگ کو گھوڑے سے اترنے کے لیے کہا۔ ہاشم بیگ نے حکم کی تعمیل کی اور کسی نے اس کی آنکھوں سے پٹی کھولتے ہوئے کہا۔ تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ ہم ابھی ملک جہان خاں کو اطلاع دیتے ہیں۔

ہاشم بیگ کو تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گا۔ دو آدمی سامنے ایک بلند پہاڑی کی طرف چل دیے اور باقی اس کے گرد بیٹھ گئے۔ ہاشم نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو اسے ایک تنگ وادی کا نشیب اور باقی تین اطراف بلند پہاڑیاں دکھائی دیں۔ چند منٹ وہ بے حس و حرکت بیٹھا ان لوگوں کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے جرات سے کام لیتے ہوئے سوال کیا۔ مجھے کب تک یہاں ٹھہرنا پڑے گا؟

ایک آدمی نے جواب دیا ہم نے ملک جہان خاں کو پیغام بھیج دیا ہے انہیں یہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

قریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد ہاشم بیگ کو قریب ہی گھنے درختوں میں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔

وہ آرہے ہیں۔ایک آدمی نے اُٹھتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھی کھڑے ہو گئے۔ہاشم بیگ نے بھی ان کی تقلید کی۔

تین سوار ان کے قریب پہنچ کر گھوڑوں سے اُتر پڑے۔ان میں سے ایک کے ہاتھ میں وہ نقشہ تھا جو انہوں نے ہاشم بیگ سے چھینا تھا۔وہ فوراً ہاشم بیگ کی طرف بڑھا اور اسے نقشہ دکھاتے ہوئے بولا تم اس نقشے کی مدد سے یہاں تک پہنچے ہو؟

ہاں!ہاشم بیگ نے جواب دیا۔

تم نے یہ کہاں سے حاصل کیا تھا؟

ہاشم بیگ نے جواب دیا۔میں ایسے سوالات کا جواب صرف ملک جہان خاں کو دے سکتا ہوں۔

میں ملک جہاں خاں ہوں اور تمہیں میرے ساتھ کوئی بات کرنے سے پہلے یہی اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ مجھے جھوٹ اور سچ پرکھنے میں دیر نہیں لگی۔اب بتاؤ کہ یہ نقشہ تم کو کہاں سے ملا؟

یہ نقشہ میں نے آپ کی ایک مفرور قیدی سے حاصل کیا تھا۔اس کے ساتھ میری ملاقات میر قمر الدین کے ہاں ہوئی تھی۔میرے لیے آپ تک رسائی حاصل کرنا ضروری تھا۔

تم مجھے اس شخص کا نام بتا سکتے ہو؟

اس کا نام سراج الدین تھا۔

تم جھوٹ کہتے ہو میں اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔

ملک جہان خاں کے ساتھی اب ہاشم بیگ کی طرف غضب آلود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔اس نے سنبھل کر کہا۔ہو سکتا ہے کہ اس مے مجھے اپنا نام غلط بتایا ہو۔

ملک جہان خاں نے اپنے ساتھیوں کیطرف دیکھا اور ایک آدمی جلدی سے درخت پر چڑھ کر اس نے ایک مضبوط شاخ کے ساتھ ایک رسا باندھ کر نیچے لٹکا دیا۔ دو آدمی ہاشم بیگ کو پکڑ کر درخت کے نیچے لے گئے اور انہوں نے رسے کے سرے کا پھندا بنا کر ہاشم بیگ کے گلے میں ڈال دیا۔

ملک جہان خاں نے کہا۔اب بتاؤ تم یہاں کس لیے آئے ہو اور تمہارے ساتھ جو فوج آرہی ہے وہ یہاں سے کتنی دور ہے؟

ہاشم بیگ نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں ایک عزیز کی تلاش میں آیا ہوں۔اور میرے ساتھ کوئی فوج نہیں ائی ہے۔اس کے باوجود اگر مجھے پھانسی دے کر آپ کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو خوشی سے یہ شوق پورا کر لیجیے۔

یہاں تمہارا عزیز کون ہے؟

مُراد علی۔

ملک جہان خاں چند ثانیے پریشانی اور تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔بالآخر اس نے ہاشم بیگ کے گلے سے پھندا اُتارتے ہوئے کہا۔مُراد علی کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے؟

آپ یہ سمجھ لیجیے کہ وہ میرا بھائی ہے۔

سرنگا پٹم میں جو لوگ مراد علی کو اپنا بھائی کہہ سکتے ہیں ان کو جانتا ہوں ارو تمہاری شکل وصورت ان سب سے مختلف ہے۔

میرا گھر سرنگا پٹم نہیں حیدر آباد ہے۔

ملک جہان خاں نے جھنجھلا کر کہا۔ تم ابھی کہتے تھے کہ میں سرنگا پٹم سے آ رہا ہوں۔ میرے لیے معمّا بننے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارا نام کیا ہے؟

میرا نام ہاشم بیگ ہے اور میں کئی دن شمال کی سرحد کی خاک چھاننے کے بعد آپ کی جائے پناہ کا پتہ معلوم کرنے کے لیے سرنگا پٹم گیا تھا لیکن اگر آپ مجھے مُراد علی کے سامنے لے جائیں تو یہ معمّا اسی وقت حل ہو سکتا ہے۔

ملک جہان خاں نے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ تم اسے پڑاؤ میں لے آؤ۔ پھر گھوڑے پر سوار ہوتے ہی اسے ایڑ لگا کر گھنے درختوں میں رُوپوش ہو گیا۔

☆

ہاشم بیگ گھوڑے پر سوار ہو کر باقی آدمیوں کے ساتھ چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بلند پہاڑی کی دوسری طرف ایک اور تنگ وادی میں جگہ جگہ بوسیدہ خیمے اور گھاس پھونس کے چھپر دیکھ رہا تھا۔ وادی میں داخل ہونے کے بعد ایک کُشادہ خیمے کے سامنے اسے ملک جہان خاں اور مُراد علی دکھائی دیے۔ وہ گھوڑے سے چھلانگ لگا بھاگتا ہوا آگے بڑھا لیکن مُراد علی نے منہ پھیر لیا اور ہاشم بیگ کے پاؤں زمین کے ساتھ پیوست ہو کر رہ گئے۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ مُراد علی میں ہاشم ہوں۔

مجھے معلوم ہے لیکن آپ کو میری تلاش میں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔

ہاشم کا دل بیٹھ گیا۔ تاہم اس نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ مُراد علی میں بے گناہ ہوں۔

مُراد علی نے جواب دیا۔ آپ کو صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے

معلوم ہے آپ نے میرے بھائی کی جان بچانے کی کوشش کی تھی اور میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

ہاشم بیگ نے ملتجی ہو کر ملک جہان خاں کی طرف دیکھا اور کہا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں چند منٹ تنہائی میں ان سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

مُراد علی نے کہا۔ اب باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر آپ مجھے یہ بتانے آئے ہیں۔ آپ کی سفارش پر انگریزوں نے میری خطائیں معاف کر دی ہیں اور میں اپنے گھر واپس جا سکتا ہوں تو آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔

مُراد علی کے بازو پر ہاشم بیگ کے ہاتھ کی گرفت اچانک ڈھیلی پڑ گئی اور وہ انتہائی مایوسی اور اضطراب کی حالت میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

مُراد علی نے ملک جہان خاں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ میں اس بات کی ضمانت دے سکتا ہوں کہ یہ ہمارے متعلق کوئی بُرا ارادہ لے کر نہیں آئے۔ آپ انہیں واپس پہنچانے کا انتظام کر دیجیے۔

ہاشم بیگ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز بیٹھ گئی۔ مُراد علی خیمے کی طرف بڑھا ہاشم چند ثانیہ اپنے ہونٹ بھینچنے کے بعد پوری قوت سے چلایا۔ مُراد ٹھہرو! مجھے ثمینہ نے بھیجا ہے۔

مُراد علی کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ لیکن وہ مُڑ کر ہاشم بیگ کی طرف دیکھنے کی بجائے گردن جھکائے کھڑا رہا۔

ہاشم بیگ بھاگ کر آگے بڑھا اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ مُراد میں نے شہباز اور ان کے والد کی موت پر ثمینہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے تھے۔ لیکن اب کی وہ رو رہی تھی میں تمہیں لینے آیا ہوں۔

مراد علی نے مضطرب ہو کر جواب دیا۔ میں نے ثمینہ کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ اگر میں زندہ رہا تو کسی دن ضرور واپس آؤں گا لیکن اب آپ اسے یہ پیغام بھیج دیجیے کہ مُراد مر چکا ہے اور آپ نے جس آدمی کے ساتھ اس جنگل میں ملاقات کی تھی وہ اس کی لاش تھی۔

مُراد میں اطمینان سے بیٹھ کر تمہارے ساتھ چند باتیں کرنا چاہتا ہوں میں نے تمہیں بڑی مشکل سے تلاش کیا ہے۔

بہت اچھا آیئے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ میرے باتوں سے آپ کو تکلیف ہوگی۔

وہ خیمے میں داخل ہوئے اور چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ہاشم بیگ نے کہا۔ مُراد مجھے معلوم ہے کہ میری باتوں سے تمہیں تکلیف ہوگی۔ لیکن تم مجھے اگر یہ سمجھا سکو کہ تمہاری اس جنگ سے اہلِ میسور کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو میں تمہارا ساتھ دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔

مُراد علی نے جواب دیا۔ دیکھیے ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مجھے معلوم ہے کہ ہم لوگ اس قوم کے گناہوں کا کفارہ ادا نہیں کر سکتے جس کا دامن سُلطانِ شہید کے خون سے آلودہ ہے۔ ہم ان لوگوں کو عزت اور آزادی کا راستہ نہیں دکھا سکتے جن کی صفوں میں میر قمر الدین جیسے غدار گھسے ہوئے ہیں۔ ہم اُس ماضی کو واپس نہیں لا سکتے جس کا ہر لمحہ زندگی کی خواہشات سے لبریز تھا۔ یہ دُنیا ہمارے لیے تاریک ہو چکی ہے۔ ہماری عزت اور آزادی کے دشمن ہم سے زندگی کی تمام راحتیں چھین چکے ہیں۔ اب آخری جو چیز ہمارے لیے رہ گئی ہے وہ عزت کی موت ہے اور وہ ہمیں اس سے محروم نہیں کر سکتے۔ آپ مجھے زیادہ سے زیادہ سمجھا سکتے ہیں کہ ہماری جنگ بے سُود ہے۔ لیکن میرا آخری جواب یہی ہوگا کہ میں آخری دم تک **ملک جہان**

خاں کا ساتھ دینے کا وعدہ کر چکا ہوں میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ڈھونڈنے میں اتنی تکلیف اٹھائی ہے لیکن مجھے یہ مشورہ نہ دیں کہ میں ملک جہان خاں سے بدعہدی کر کے واپس چلا جاؤں اپنے ساتھیوں سے بدعہدی اور بےوفائی کے بعد میں ان لوگوں کو منہ نہیں دکھا سکوں گا۔ جو مجھے انور علی کا بھائی اور معظم علی کا بیٹا سمجھتے ہیں۔ آپ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟

ہاشم بیگ نے جواب دیا۔ کچھ نہیں۔ میں اب کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اب دلیلوں سے زیادہ آپ کو دُعاؤں کی ضرورت ہے۔

تو میرے لیے یہ دُعا کیجیے کہ زندہ رہنے کی خواہش مجھے قیامت کے دن سرنگاپٹم کے شہیدوں کے ساتھ اٹھنے کی سعادت سے محروم نہ کر دے۔

ہاشم بیگ نے کہا۔ مُراد بعض اوقات لڑنے کی بجائے اپنی تلوار نیام میں ڈالنے کے لیے زیادہ ہمت زیادہ حوصلہ اور زیادہ صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں خدا سے دُعا کروں گا کہ آپ کسی دن ان لوگوں کے متعلق بھی سوچ سکیں جنہیں مستقبل کے متعلق اپنے حوصلے اور ولولے بلند رکھنے کے لیے آپ جیسے اولوالعزم انسانوں کی رفاقت اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔

میں جانے سے پہلے آپ کی یہ غلط فہمی دُور کر دینا چاہتا ہوں کہ میں آپ کو انگریزوں کی اطاعت قبول کر لینے کا مشورہ دینے آیا تھا۔ نہیں میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا۔ میں آپ کو صرف قبول کر لینے کا مشورہ دینے آیا تھا۔ نہیں میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا۔ میں آپ کو صرف یہ بتانے آیا تھا کہ سُلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد میسور کی حُریت پسندوں کا آخری قلعہ مسمار ہو چکا ہے۔ لیکن اگر آپ مستقبل کی اُمید پر زندہ رہنے کی کوشش کریں تو خدا کی رحمت سے یہ بعید نہیں کہ

آپ میسور سے باہر کوئی اور قلعہ تلاش کر سکیں۔ میں ملک جہان خاں کے جذبہ حُریت کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن وہ ایک ایسی قوم کی ڈھال اور تلوار نہیں بن سکتا جس نے اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ ڈالا ہو۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ میں آپ کو کوئی نصیحت کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ میں ان بدقسمت انسانوں میں سے ہوں جو اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف حالات کی مجبوریوں ے سامنے سر جُھکا دیتے ہیں۔

ہاشم بیگ یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

مُراد علی نے کہا۔ آپ جا رہے ہیں؟

ہاں اب یہاں میرا کام ختم ہو چکا ہے۔

آپ تھکے ہوں گے لیکن میں آپ کو یہاں ٹھہرنے کی دعوت نہیں دے سکتا۔ ان دنوں ہمیں ہر وقت دشمن کے حملے کا خطرہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ لڑائی کے وقت یہاں رہیں۔ مُراد علی یہ کہہ کر اٹھا اور ہاشم بیگ کے ساتھ خیمے سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد ہاشم بیگ کو جنگل سے باہر پہنچانے کے لیے بیس آدمیوں کا قافلہ تیار ہو چکا تھا۔ اس نے ملک جہاں خاں کے ساتھ مُصافحہ کرنے کے بعد مُراد علی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے آپ کو ایک بات نہیں بتائی۔ ثمینہ یہ کہتی تھی کہ وہ مرتے دم تک آپ کا انتظار کرے گی۔ ہاں مجھے ایک اور بات یاد آ گئی۔ تمہارے بھائی نے مرتے وقت جواہرات کی ایک تھیلی میرے حوالے کی تھی۔ میں تمہاری یہ امانت ثمینہ کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ اگر تم وہاں جانا پسند نہیں کرتے تو اپنی امانت کسی آدمی کو بھیج کر منگوا لینا۔

مُراد علی نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ آپ وہاں جائیں گے؟

ہاں پہلے میں وہاں جاؤں گا۔

ثمینہ سے کہیے۔ مُراد علی اپنا فقرہ پورا کرنے کی بجائے ہاشم بیگ کی طرف دیکھتا رہا۔

کیا کہوں؟ بولو مُراد خاموش کیوں ہو گئے؟

کچھ نہیں ۔ خدا حافظ! مُراد علی یہ کہہ کہ لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا خیمے کی طرف چل دیا۔ خیمے میں داخل ہونے کے بعد وہ نڈھال سا ہو کر چٹائی پر لیٹ گیا۔ باہر گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ ملک جہان خاں خیمے میں داخل ہوا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

جہان خاں نے کہا۔ مُراد اگر تم جانا چاہتے ہو تو میں تم پر کوئی پابندی عائد نہیں کرونگا۔ مُراد علی نے کچھ کہے بغیر سر پھیر دیا۔

چند دن بعد ہاشم بیگ، بلقیس اور ثمینہ کے سامنے اپنے سفر کے واقعات بیان کر رہا تھا اور ثمینہ ماں اور بہنوئی کو قائل کرنے سے زیادہ اپنے دل کو جھوٹی تسلی دینے کے لیے بار بار یہ کہہ رہی تھی۔ وہ ضرور آئیں گے۔ بھائی جان وہ ضرور آئیں گے۔ امی جان مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئیں گے۔

اکتیسواں باب

بلقیس کے ہاں قریباً ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد ہاشم بیگ ادھونی واپس چلا گیا اس کے بعد ثمینہ کچھ عرصہ جہان خاں کی سرگرمیوں کے متعلق مختلف اور متضاد خبریں سنتی رہی۔ کبھی یہ خبر آتی کہ وہ جنوب کی طرف پیش قدمی کرنے کے بعد فلاں علاقہ فتح کر چکا ہے اور کبھی یہ خبر آتی کہ وہ فلاں مقام پر انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد پسپا ہو چکا ہے۔

۱۸۰۰ء کے موسمِ برسات میں انگریزوں کے لیے ملک جہان خاں کی سرگرمیاں کافی پریشان کن ثابت ہو رہی تھیں۔ لیکن میسور کی ہمسایہ ریاستوں کے حکمرانوں کی غیر جانبداری کے باعث جہان خاں کا اکا دکا لڑائیاں ایک وسیع پیمانے پر جنگ آزادی کا پیش خیمہ نہ بن سکیں۔ گزشتہ جنگوں میں اس کے کئی ساتھی مارے جا چکے تھے۔ اور کئی مایوس اور بددل ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ انگریزوں نے ان سرفروشوں کی جماعت کے ساتھ اپنے جاسوسوں کی ایک اچھی خاصی تعداد شامل کر دی تھی۔ یہ لوگ ایک طرف جہان خاں کے ساتھیوں میں مایوسی اور بددلی پھیلاتے اور دوسری طرف انگریزوں کو جہان خاں کی سرگرمیوں سے باخبر رکھتے۔

موسمِ برسات کے اختتام پر میسور کی شمالی سرحد سے اس قسم کی خبریں آ رہی تھیں کہ کرنل آرتھر ولزلی جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک جہان خاں کی سرکوبی کی مہم سونپی تھی ایک بھاری لشکر کے ساتھ شمالی سرح کے جنگلوں اور پہاڑوں میں باغیوں کا پیچھا کر رہا ہے۔ پھر ایک دن یہ خبر مشہور ہوئی کہ ملک جہان خاں ایک خونریز معرکے میں شکست کھانے کے بعد شہید ہو چکا ہے اور کرنل ولزلی کے دستے ان کے رہے سہے ساتھیوں کی سرکوبی میں مصروف ہیں

بلقیس نے صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے گاؤں کا ایک آدمی ہاشم بیگ کے پاس بھیجا۔ ہاشم بیگ نے اس خط کے جواب میں ملک جہان خاں کی موت کی خبر کی تصدیق کر دی۔ لیکن مراد علی کے بارے میں اس کا جواب یہ تھا کہ مجھے انتہائی کوشش کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

ملک جہان خاں کی موت کی خبر سننے کے بعد مراد علی کے متعلق ثمینہ کی بے قراری اور بے چینی میں آئے دن اضافہ ہوتا گیا۔ انتظار کے لمحات اسے برسوں سے زیادہ طویل محسوس ہوتے تھے۔ ماہِ اکتوبر کی ایک شام وہ حسبِ معمول تنہا اپنے مکان کی چھت پر کھڑی تھی۔ ہوا خوشگوار تھی۔ گاؤں کے چرواہے اور کسان دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد اپنے گھروں کو واپس آرہے تھے۔ دُور دُور کی بستیوں کے گھروں سے ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ گاؤں کی فضا اردگرد درختوں پر جمع ہونے والے پرندوں کے چہچہوں سے لبریز تھی۔

تھوڑی دیر بعد گاؤں پر رات کا سکوت طاری ہو گیا اور آسمان پر اکا دکا ستارے نظر آنے لگے۔ پھر مشرق کی ایک پہاڑی کے عقب سے چاند نمودار ہونے لگا۔ ڈیوڑھی سے باہر آنکھ مچولی کھیلنے والے بچوں کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ ثمینہ تھوڑی دیر چھت پر ٹہلنے کے بعد منڈیر پر بیٹھ گئی۔ چاند اب پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہو چکا تھا۔ نیچے مردانہ حویلی کے صحن میں نوکر باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد گاؤں کی مسجد سے عشاء کی اذان سنائی دینے لگی۔ ثمینہ نیچے جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اسے ڈیوڑھی کی طرف گھوڑے کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک گھوڑا جس کا سوار زین پر جھکا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا ڈیوڑھی کے راستے بیرونی صحن میں داخل ہوا۔

کون ہے؟ ایک نوکر نے کہا۔

سوار نے کوئی جواب دیے بغیر گھوڑے سے اترنے کی کوشش کی لیکن زمین پر پاؤں رکھتے ہی وہ منھ کے بل گر پڑا۔ نوکر بھاگتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔

یہ کون ہے؟ اسے کیا ہوا؟

یہ زخمی ہے۔ یہ بے ہوش ہے۔ یہ بیمار ہے۔ وہ ایک دوسرے کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ثمینہ اُٹھ کر زینے کی طرف بڑھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ نیچے اتر کر باہر کی حویلی کیطرف بڑھی۔ پیچھے سے ماں کی آواز آئی۔ ثمینہ کہاں جا رہی ہو؟

ثمینہ نے مُڑ کر دیکھے بغیر جواب دیا۔ امی جان میں یہیں ہوں۔ میں ابھی آتی ہوں۔

اتنی دیر میں نوکر نووارد کو ایک کھاٹ پر لٹا چکے تھے۔ منور خاں ثمینہ کو دیکھ کر چلایا۔

بی بی جی۔ یہ آ گئے۔ میرا خواب درست نکلا۔ لیکن یہ بے ہوش ہیں۔ یہ بخار سے جل رہے ہیں۔ اگر گاؤں میں کوئی اچھا طبیب ہو تو اسے بلوایئے!

ثمینہ کی نگاہیں نووارد کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ پھر وہ اچانک آگے بڑھی اور مراد علی کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے چلائی۔ انھیں اندر لے چلو اور طبیب کو فوراً بلاؤ۔ منور تم امی جان کو اطلاع دو۔



کوئی ایک گھنٹے بعد مراد علی نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں تو وہ ایک کمرے

میں لیٹا ہوا تھا۔ایک عمر رسیدہ طبیب اس کی زخمی بازو پر پٹی باندھ رہا تھا اور گھر کے نوکر اور گاؤں کے چند آدمی اس کے گرد جمع تھے۔اس نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد منور خاں کی طرف نظریں گاڑ دیں اور اسے پانی لانے کے لیے کہا۔

منور بھاگتا ہوا باہر نکلا اور پانی کا کٹورا لے آیا۔مراد علی نے پانی پینے کے لیے سر اٹھایا لیکن نقاہت کے باعث اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اس نے دوبارہ اپنا سر تکیے پر رکھ دیا ایک آدمی نے جلدی سے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور پانی کے چند گھونٹ پلانے کے بعد دوبارہ لٹا دیا۔

طبیب نے مرہم پٹی سے فارغ ہونے کے بعد اسے ایک دوائی پلائی اور کمرے میں جمع ہونے والے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔انھیں آرام کی ضرورت ہے اس لیے آپ تشریف لے جائیں۔

وہ یکے بعد دیگرے کمرے سے نکل گئے۔لیکن منور اپنی جگہ کھڑا رہا۔مُراد علی نے نحیف آواز میں کہا۔منور تم کیسے پہنچ گئے؟

منور کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ آئے اور کچھ دیر اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا۔مجھے ہاشم بیگ صاحب نے یہاں بھیج دیا تھا۔میرا خیال تھا کہ آپ یہاں پہنچ چکے ہوں گے۔

مُراد علی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔منور کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا اور جب مراد علی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تو وہ مضطرب سا ہو کر چلایا۔

بھائی جان! بھائی جان!

طبیب جلدی سے اس کی نبض ٹٹولنے لگا۔

مُراد علی نے آنکھیں کھولیں اور اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا میں

ٹھیک ہوں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ آپ تھوڑا سا دودھ پی لیں۔ طبیب نے کہا۔

نہیں ابھی نہیں، مراد علی نے آنکھیں بند کرتے ہوئے جواب دیا، طبیب نے منور کی طرف متوجہ ہو کر کہا، میں جاتا ہوں تم بیگم صاحبہ کو اطلاع دے دو، اب ان کی طبیعت ٹھیک ہے، لیکن انھیں آرام کی اشد ضرورت ہے، اگر رات کے وقت ضرورت پڑے تو مجھے اطلاع دیں،

مراد علی کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی، روشن دان سے سورج کی ابتدائی کرنیں کمرے میں آرہی تھیں۔ ثمینہ اس کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھی سو رہی تھی، اور منور دروازے کے پاس ایک چٹائی پر لیٹا خراٹے لے رہا تھا، ثمینہ کی گردن ایک طرف جھکی ہوئی تھی، اور بالوں کی ایک لٹ اس کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔

یہ کمرہ وہی تھا جہاں ثمینہ کے ساتھ اس کی آخری ملاقات ہوئی تھی، شہباز کی یادگاریں اس طرح پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر وہ بستر پر پڑا ثمینہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پیاس کی شدت سے اس کا گلا خشک ہو رہا تھا، اس کے بستر کے دائیں طرف ایک تپائی پر پانی کی صراحی پڑی ہوئی تھی، مراد علی ثمینہ یا منور کو آواز دینے کی بجائے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے صراحی سے پانی کا ایک کٹورہ بھر کر پیا، اور جب وہ دوسری بار کٹورے میں پانی ڈال رہا تھا۔ تو ثمینہ نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ مراد علی کی طرف ایک نظر دیکھنے کے بعد اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے صراحی پکڑلی۔ اور کٹورے میں پانی بھر کر اسے پیش کر دیا۔ مراد علی کا سر چکرا رہا تھا، وہ پانی پینے کے بعد لیٹ گیا، اور ثمینہ اپنے بالوں کو درست کرتی ہوئی کرسی سے اٹھی،

اور اس نے کہا، امی جان رات کے وقت آپ کے لیے دودھ لائی تھیں، اور وہ یہاں پڑا پڑا خراب ہو گیا۔ آپ سو رہے تھے۔ ہم نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ امی جان ابھی اٹھ کر گئی ہیں۔ آپ کو بھوک لگی ہو گی، میں تازہ دودھ لے آؤں؟۔

مراد علی نے نحیف آواز میں کہا ثمینہ بیٹھ جاؤ۔

وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی، اور کچھ دیر توقف کے بعد بولی، رات کے وقت آپ کو بہت بخار تھا۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟

میں ٹھیک ہوں، راستے میں مجھے بار، بار یہ خیال آتا تھا کہ میں شاید یہاں تک نہ پہنچ سکوں، رات کے وقت مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں، میں ایک مدت بعد اس طرح سویا ہوں، مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو اتنی تکلیف دی، آپ شاید ساری رات نہیں سوئیں۔

مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گے۔ یہ کہتے ہوئے ثمینہ نے ذرا گردن اٹھا کر مراد علی کی طرف دیکھا

اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ مراد علی نے کہا، ثمینہ میرے لیے ساری دنیا میں اس گھر کے سوا کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔

ثمینہ نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے، اور گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا، گاؤں کا طبیب زیادہ تجربہ کار نہیں۔ امی جان نے ادھونی میں بھائی جان ہاشم بیگ کو پیغام بھیج دیا ہے۔ کہ وہ کوئی اچھا طبیب لے کر یہاں پہنچ جائیں۔

مراد علی نے کہا، انھیں تکلیف دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں امی جان کو اطلاع دیتی ہوں۔ ثمینہ یہ کہہ کر اٹھی، اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

رہائشی مکان کا صحن عبور کرنے کے بعد وہ ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ بلقیس

جس نے کہ ساری رات اس کے ساتھ آنکھوں میں کاٹی، اپنے بستر پر پڑی گہری نیند سو رہی تھی۔ ثمینہ بے اختیار آگے بڑھی اور اس کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں لینے لگی۔

ماں نے انتہائی گھبراہٹ کی حالت میں کہا، کیا ہوا ثمینہ بولتی کیوں نہیں، مراد کیسا ہے،، امی جان،، امی جان وہ ٹھیک ہیں۔ وہ ابھی میرے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔

☆

تھوڑی دیر بعد بلقیس اور ثمینہ مراد علی کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور وہ انھیں اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ اپنی آخری جنگ اور اپنے زخمی ہونے کے واقعات بیان کرنے کے بعد اس نے بلقیس سے مخاطب ہو کر کہا، چچی جان شکست کے بعد میسور کی حدود میں میرے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ انگریزوں نے میرے سر کی قیمت مقرر کر رکھی تھی۔ میرے ساتھ پچاس آدمیوں نے سرحد کے ایک مرہٹہ سردار کے پاس پناہ لی تھی۔ ہم اسے اپنا دوست سمجھتے تھے، وہ گزشتہ لڑائیوں میں درپردہ ہماری مدد کرتا تھا۔ لیکن ملک جہان خاں کی موت کے بعد دنیا بدل چکی تھی۔ اور ہمیں پتا چلا کہ یہ شخص ہمیں انگریزوں کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ایک رشتہ دار نے ہمیں باخبر کر دیا۔ اور ہم وہاں سے نکل آئے۔ زخمی اور بیمار ہونے کے باعث میں زیادہ دیر تک اپنے دوستوں کا ساتھ نہ دے سکا۔ اور وہ میرے اصرار پر مجھے جنگل کی ایک بستی میں چھوڑ کر چلے گئے، اس بستی کے کسان اور چرواہے نہایت نیک دل ثابت ہوئے۔ لیکن میری حالت بہت خراب تھی۔ اور مجھے وہاں مرنا پسند نہ تھا۔

بلقیس نے آب دیدہ ہو کر کہا، بیٹا تم یہاں سیدھے کیوں نہ آئے۔

چچی جان مجھے ڈر تھا کہ آپ میری وجہ سے کسی مشکل میں نہ پھنس جائیں۔ اور اب بھی میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ میں سواری کے قابل ہوتے ہی آپ سے اجازت چاہوں گا۔ ثمینہ کے چہرے پر غم کے بادل چھا گئے۔

بلقیس نے کہا بیٹا یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں، اگر کوئی مشکل پیش آئی تو مجھے یقین ہے کہ ہاشم تمہاری مدد کر سکے گا۔ حیدر آباد اور ادھونی کے کئی با اثر حکام اس کے دوست ہیں۔

مراد علی نے کہا چچی جان جو امراء دکن کی حکومت کو سلطان ٹیپو کے قتل میں حصہ دار بننے سے نہیں روک سکے۔ وہ میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ نظام نے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے صرف اہل میسور کے قتل عام میں حصہ ہی نہیں لیا۔ بلکہ اپنی رعایا کو بھی بے دست و پا کر کے ان کے آگے ڈال دیا۔ اس سے یہ توقع رکھنا خود فریبی ہے۔ کہ وہ میری خاطر اپنے انگریز آقاؤں کو ناراض کرنا پسند کرے گا۔ اگر مجھ اس سے کوئی نیک سلوک کی توقع ہوتی تو بھی میں اس کی پناہ لینا گوارہ نہ کرتا، اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ اب ذلت اور غلامی کی زندگی اختیار کیے بغیر کوئی چارہ نہیں، تو بھی میں ایسے آقا کی اطاعت قبول نہیں کروں گا جو خود انگریزوں کا غلام ہو۔

لیکن تم کہاں جاؤ گے؟ بلقیس نے مغموم لہجے میں سوال کیا۔

مراد علی نے جواب دیا،، چچی جان میں ایک ایسا ملک دیکھ آیا ہوں جس کے کسان اور چرواہے ابھی تک آزادی کے گیت گا رہے ہیں، میں افغانستان جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے وہ لوگ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ جنھیں دلی کے مسلمانوں کی فریاد پانی پت کے میدان میں لے آئی تھی، دریائے کابل کے کنارے ایک چھوٹی

سی بستی ہے، اور اس بستی کا عمر رسیدہ سردار پانی پت کے مجاہدوں کے ساتھ تھا۔ وہ چچا اکبر خاں اور ابا جان کو جانتا تھا۔ اور اس نے مجھے آپ کے قبیلے کے ان لوگوں کا پتا دیا تھا۔ جو روہیل کھنڈ سے ہجرت کرنے کے بعد وہاں آباد ہو گئے تھے۔

ثمینہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی قوت گویائی گویا جواب دے چکی تھی۔ بلقیس نے انتہائی کرب کی حالت میں مراد علی کی طرف دیکھا۔ اور کہا بیٹا تم افغانستان کے تازہ حالات سے باخبر نہیں ہو۔ وہاں خانہ جنگی شروع ہو چکی ہے اور زمان شاہ کے متعلق تو یہاں تک مشہور ہے، کہ وہ باغیوں کے ہاتھوں شکست کھا کر بھاگ چکا ہے۔

مراد علی نے کہا چچی جان میں اپنے مصائب کے بدترین ایام میں بھی افغانستان کے حالات سے بے خبر نہیں تھا۔ میں زمان شاہ کے متعلق تمام افواہیں سن چکا ہوں۔ اور ممکن ہے یہ افواہیں صحیح ہوں۔ لیکن اگر قوم زندہ ہو تو وہ بدترین حالات کو بھی اپنے لیے سازگار بنا لیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ افغانستان کے باشندے زمان شاہ کے بعد بھی آزادی کے پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دیں گے، جب کوئی بیرونی خطرہ پیش آئے گا، تو افغان سرداروں کو متحد اور منظم ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ ان تشویش ناک خبروں نے افغانستان جانے کے متعلق میرا ارادہ اور بھی پختہ کر دیا ہے۔ ممکن ہے میں ان لوگوں کی خدمت کر سکوں۔ اور انھیں انگریزی استبداد کیا س سیلاب کی تندی و تیزی سے آگاہ کر سکوں، جو میسور کے عظیم قلعے مسمار کرنے کے بعد بڑی تیزی سے شمال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں احمد شاہ ابدالی کے پاس اسلام کی ان بیٹیوں کی فریاد لے کر جاؤں گا۔ جنھوں نے اپنی آنکھوں سے سرنگاپٹم کا روز قیامت دیکھا تھا۔ میں انھیں یہ بتاؤں گا کہ قوموں کی عزت اور آزادی کے

لیے اندرونی غدار کس قدر خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ اسلام کی ناموس کے رکھوالو تمسر نگ اپٹم کے واقعات سے سبق سیکھو، اگر تمھاری صفوں میں کوئی میر صادق ہے۔ تو وقت آنے سے پہلے اس سے نجات حاصل کر لو۔ اگر تم بیرونی خطرات سے آنکھیں بند کر کے آپس میں الجھ گئے، تو تمہارا انجام ہم سے مختلف نہ ہوگا۔

مراد علی جوش کی حالت میں بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بلقیس اضطراب کی حالت میں اٹھ کر آگے بڑھی اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ بیٹا تم کو بخار ہے۔ لیٹ جاؤ۔ جب تم تندرست ہو جاؤ گے تم میں تمہارا راستہ نہیں روکوں گی۔

وہ لیٹ گیا۔ بلقیس نے ثمینہ کی طرف دیکھا اور کہا آؤ بیٹی انھیں آرام کرنے دو۔

چار دن بعد ادھونی کا طبیب بلقیس کے گھر پہنچ گیا، اور اس نے مراد علی کے ساتھ رسمی علیک سلیک کے بعد اپنی جیب سے ایک خط نکال کر اسے پیش کر دیا۔

مراد علی نے خط کھول کر پڑھا۔ ہاشم بیگ نے لکھا تھا۔

عزیز بھائی خدا کا شکر رہے آپ خالہ جان کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ میں ادھونی کے قابل ترین طبیب حکیم مصطفٰے کو آپ کے پاس علاج کے لئے بھیج رہا ہوں۔ میں خود حاضر ہونا چاہتا تھا، لیکن مجھے شاید ایک ہفتے تک چھٹی نہ مل سکے۔ تنویر اور امی جان میرے ساتھ ہیں۔ اور وہ بھی آپ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ ہم انشا اللہ زیادہ سے زیادہ دس یا پندرہ دن تک آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔

تمہارا بھائی ہاشم

حکیم مصطفٰے کا علاج شروع کرنے سے پانچ دن بعد مراد علی کا بخار اتر چکا تھا۔ اور اس کا زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو رہا تھا۔ آٹھ دن بعد اس نے پہلی بار گھر سے نکل

کرگاؤں کی مسجد میں نماز ادا کی۔اور اس سے اگلے روز حکیم مصطفےٰ خاں واپس چلا گیا۔



مرادعلی کی علالت کے ایام میں ثمینہ یہ بات بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتی تھی کہ زمانے کے انقلاب نے ان کے درمیان ایکنا قابل عبور دیوار کھڑی کر دی ہے۔اس کی آمد سے قبل وہاں جنگلوں اور پہاڑوں کا تصور کیا کرتی تھی، جہاں ملک جہان خان کے ساتھی مصروف پیکار تھے۔ان سرپھروں کی رفاقت میں مرادعلی کی زندگی کی مختلف تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتیں۔کبھی وہ دیکھتی کہ وہ جنگ کے میدان میں شمشیر بکف کھڑا ہے۔اور اسے بندوقوں کے دھماکے،تلواروں کی جھنکار اور زخمیوں کی چیخیں سنائی دینے لگتیں۔کبھی وہ یہ دیکھتی کہ وہ بھوکے پیاسے زخمیوں کے ساتھ کسی تاریک غار میں پڑا ہوا ہے۔اور دشمن کی افواج جنگلوں اور پہاڑوں میں اسے تلاش کر رہی ہے۔رات کو سوتے وقت یہ اضطراب انگیز خیالات بھیانک سپنوں میں تبدیل ہو جاتے۔

باغیوں کی شکست اور ملک جہان خاں کی موت کی خبر سننے کے بعد اس کا اضطراب جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔تاہم اس کی یہ امید آخری وقت قائم رہی کہ اگر مرادعلی زندہ ہے تو وہ ضرور آئے گا۔وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ میری زندگی کا ہر لمحہ اس کی یاد سے لبریز ہے۔

وہ اٹھتے، بیٹھتے،سوتے، جاگتے اس کی واپسی کا تصور کیا کرتی۔پھر بارگاہ ایزدی میں اسکی دعائیں مستجاب ہوئیں، اور مرادعلی اس کے گھر پہنچ گیا۔لیکن یہ وہ

نوجوان نہ تھا جو چند برس قبل اس سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا تھا۔ جس کے تصورات سے اس کی امیدوں اور سپنوں کی دنیا آباد تھی۔ مراد علی بدل چکا تھا۔ اب اس کی اجڑی ہوئی دنیا میں ثمینہ کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ افغانستان کا ارادہ ظاہر کرنے کے بعد اس نے مستقبل کے متعلق ثمینہ کی آرزوں اور امیدوں کے ٹمٹماتے چراغ بجھا دیے تھے۔

اسے یہ شکایت نہ تھی کہ وہ افغانستان کیوں جا رہا ہے۔ ثمینہ کو صرف یہ گلہ تھا کہ مراد نے اپنے زخموں کا مداوا کرتے وقت اسے قطعاً نظر انداز کر دیا تھا۔ کاش وہ صرف ایک بار یہ کہہ سکتا کہ ہمیں مستقبل کی تاریکیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے دریائے کابل کے کنارے ایک جھونپڑی تعمیر کر سکتا ہوں۔

وہ بار، بار یہ سوچتی کہ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ مراد علی میرے احساسات سے بالکل غافل ہو۔ کیا میرے تمام سپنوں کی تعبیر یہی تھی کہ وہ یہاں چند دن کے لیے آئے اور پھر ہمیشہ کے لیے کہیں چلا جائے۔۔۔ وہ اپنے دل میں شکایات کا ایک طوفان لیے ہوئے داخل ہوتی، لیکن مراد علی کا نحیف و لاغر چہرہ اور اس کی کھوئی، کھوئی آنکھیں اس کے ہونٹوں پر مہر لگا دیتیں۔ وہ ایک ثانیہ کے لئے ثمینہ کی طرف دیکھتا اور پھر نگاہیں کمرے کی چھت یا کسی دیوار کی طرف گاڑھ دیتا۔ اور وہ انتہائی کوشش کے باوجود اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتی کہ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔

ادھونی کے طبیب کی واپسی کے دو دن بعد ایک دوپہر مراد علی نیم خوابی کی حالت میں بستر پر پڑا ہوا تھا۔ ثمینہ کمرے میں داخل ہوئی۔ مراد علی نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ بولی ہاشم بھائی جان اور تنویر آپا کا پیغام

آیا ہے۔وہ ادھونی سے روانہ ہو چکے ہیں۔

اور کل یا پرسوں تک پہنچ جائیں گے۔منور کہتا تھا کہ آج آپ سیر کے لیے گئے تھے۔حکیم صاحب نے تاکید کی تھی کہ ابھی چند دن تک چلنے پھرنے سے پرہیز کیا جائے۔

میں زیادہ دور نہیں گیا تھا۔

ثمینہ چند ثانیے تذبذب کی حالت میں کھڑی رہیاور پھر آہستہ، آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔

ثمینہ مراد علی نے کہا۔

وہ رک گئی اور مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

بیٹھ جاؤ ثمینہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

ثمینہ نے اپنے دل میں کچھ خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں۔اور وہ آگے بڑھ کر اس کے دائیں ہاتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔

ثمینہ مراد علی نے قدرے توقف سے کہا،، تم مجھ سے خفا ہو۔

،، وہ کس بات پر؟ ثمینہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

تم اس بات پر خفا ہو کہ میں افغانستان جا رہا ہوں۔

ثمینہ نے اپنے ہونٹوں پر مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا میرے خفا ہونے سے کیا ہوتا ہے۔

ثمینہ میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پہلی بار جب میں آخری بار تم سے رخصت ہوا تھا، ت ومیسور کے افق پر ایک تاریک اندھی کے آثار دیکھنے کے باوجود میری دنیا زندگی کے ولوں سے لبریز تھی۔اور مجھے یقین تھا کہ میں کسی دن واپس آ کر روئے

زمین کی تمام خوشیاں تمہارے قدموں میں ڈھیر کردوں گا۔ میں تمھیں اس وطن اور اس گھر کی زینت بناؤں گا۔ جو تمھارے وطن اور تمھارے گھر سے بہتر ہے۔ لیکن اب میری دنیا بدل چکی ہے میرا کوئی گھر نہیں میرا کوئی وطن نہیں۔ میں وہ تہی دست مسافر ہوں جس کا قافلہ لٹ چکا ہے۔ اب میں تمھیں اپنے آلام ومصائب میں اپنا حصہ دار نہیں بنا سکتا۔ میں ہاشم بیگ سے ملتے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے آپ کی مجبوریوں کا علم ہے اور میں آپ کا راستہ نہیں روک سکتی۔ لیکن آپ یہاں سے تنہا نہیں جائیں گے۔ ثمینہ یہ کہہ کر اٹھی اور دروازے کی طرف چل دی۔

ثمینہ، ثمینہ مراد علی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا

اور وہ دروازے کے قریب رک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مراد علی نے کرب انگیز لہجے میں کہا، تم ایک ایسے انسان کی رفاقت قبول کرلو گی جس کے دامن میں کانٹوں کے سوا کچھ نہیں

ثمینہ جواب دینے کی بجائے مسکرائی اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو امڈ پڑے۔

ثمینہ میری بات کا جواب دو میں شہباز کی بہن اور سردار اکبر خان کی بیٹی سے پوچھتا ہوں۔ کیا وہ ایک معمولی چرواہے یا کسان کے ساتھ ایک تنگ جھونپڑے میں زندگی بسر کرسکے گی۔

اس نے جواب دیا آپ کی تنگ جھونپڑی مجھے نظام کے محلات سے زیادہ کشادہ نظر آئے گی۔

بلقیس کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا بیٹا ہاشم بیگ کا پیغام آیا ہے۔

ہاں چچی جان مجھے ثمینہ نے بتایا ہے۔

بلقیس ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور ثمینہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

مراد علی نے کہا چچی جان اگر آپ کی اجازت ہو تو میں کچھ کہوں، بلقیس شفقت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی، کہو بیٹا۔

مراد علی کچھ دیر مذبذب سا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہ اچچی جان لوگ کہتے ہیں کہ رات کی تاریکی میں انسان کا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن آپ ک یپاس آ کر میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ میں تنہا نہیں ہوں۔۔۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ۔۔۔

تم کیا کہنا چاہتے تھے بیٹا خاموش کیوں ہو گئے؟

چچی جان اس نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ آج ثمینہ کے ساتھ گفتگو کے بعد میں اپنے دل میں زندگی کے دامن کی طرف ہاتھ بڑھانے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ میرا حال آپ سے پوشیدہ نہیں، اور اپنے مستقبل کے متعلق بھی میں کوئی حوصلہ افزا بات نہیں کہہ سکتا۔ میری تمام پونجی صرف ماضی کی یادو ں تک محدود ہے۔ لیکن اپنی کم مائیگی، بے بسی اور بے چارگی کے باوجود میں ثمینہ کو اپنے مستقبل کی تاریکی میں حصہ دار بنانا چاہتا ہوں۔

بلقیس نے پیار سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیے اور کہا میرے بیٹے تمہیں یہ بات کہنے کے لیے اتنی لمبی تمہید کی ضرورت نہ تھی۔ میں ثمینہ کی ماں ہوں اور سمجھتی ہوں کہ وہ تمھارے راستے کے کانٹوں کو پھولوں سے زیادہ دلفریب سمجھتی ہے۔ میں اپنے دل میں ثمینہ کے مستقبل کا فیصلہ اسی دن ک رچکی تھی، جب تم پچھلی بار یہاں آئے تھے۔

مراد علی نے تشکر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ چچی

جان وہ زمانہ اور تھا، اس وقت میں فخر اور غرور سے سر اونچا کر کے آپ سے کوئی بات کر سکتا تھا۔ لیکن اب وہ غرور سرنگاپٹم کی خاک میں دفن ہو چکا ہے۔

بلقیس نے کہا میرے لئے صرف یہ جاننا کافی ہے کہ تم معظم علی کے بیٹے ہو۔

ثمینہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے مراد علی کی طرف مخمل کی ایک چھوٹی سی تھیلی بڑھاتے ہوئے کہا، لیجیے یہ آپ کی امانت ہے میں بھول گئی تھی،

آن کی آن میں مراد علی کے خیالات کہیں سے کہیں پہنچ گئے، اس نے تھیلی کو ہاتھ لگائے بغیر بھرائی ہوئی آواز میں کہا، ثمینہ اسے اپنے پاس رہنے دو۔ ثمینہ نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر تھیلی سنبھالے کمرے سے باہر نکل گئی۔ بلقیس نے کہا،، بیٹا ہاشم کہتا ہے وہ جواہرات بہت قیمتی ہیں۔ لیکن فرض کرو تم دنیا کے غریب ترین انسان بھی ہوتے تو بھی میں ثمینہ کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیتے ہوئے فخر محسوس کرتی۔

☆

اگلے روز مراد علی عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد واپس آیا تو اسے پتا چلا کہ ہاشم بیگ پہنچ چکا ہے۔ وہ اپنے کمرے کے قریب پہنچا تو خادمہ نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا،، جناب آپ کو بیگم صاحبہ بلاتی ہیں۔

وہ اس کے ساتھ چل دیا۔ دو منٹ بعد وہ رہائشی مکان کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا، وہاں ہاشم بیگ، تنویر اور بلقیس آپس میں باتیں کر رہے تھے، مراد علی نے السلام علیکم کہا اور ہاشم بیگ نے جلدی سے اٹھ کر گلے سے لگا لیا، اور پھر اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ ہم ابھی، ابھی آپ کے متعلق باتیں کر رہے تھے، میں ثمینہ اور خالہ جان کو مبارک دے چکا ہوں۔ اور مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ بغیر کسی

تاخیر کے آپ کی شادی کر دی جائے۔

موجودہ حالات میں آپ زیادہ دیر یہاں ٹھہر نہیں سکتے۔ جنوبی ہندوستان کے کونے کونے میں جہان خاں کے ساتھیوں کی تلاش جاری ہے۔ جس دن مجھے آپ کے یہاں پہنچنے کی اطلاع ملی تھی۔ اس سے دو دن بعد دکن کی حکومت نے ادھونی کے قریب ایک جنگل سے دس آدمیوں کو پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے انہیں بچانے کی کوشش کی تھی لیکن وہاں میرا بس نہیں چلا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض مرہٹہ سرداروں نے بھی آپ کے کئی ساتھیوں کو انگریزوں کے حوالے کر دیا ہے۔ ابھی تک انگریزوں کو شاید آپ کے بارے میں علم نہیں، لیکن آپ زیادہ عرصہ یہاں چھپ کر نہیں رہ سکتے۔ میرے لیے یہ کہنا بہت تکلیف دہ ہے کہ آپ کے لیے یہ علاقہ محفوظ نہیں۔ لیکن آپ کی سلامتی ہمارا پہلا فرض ہے۔

مراد علی نے جواب دیا میں صرف آپ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

ہاشم بیگ نے کہا، خالہ جان نے مجھے بتایا ہے کہ آپ افغانستان جانا چاہتے ہیں۔

ہاں

ہاشم بیگ بلقیس کی طرف متوجہ ہو کر بولا، خالہ جان اگر آپ میری رائے سے اتفاق کریں تو کل یا پرسوں ان کی شادی کا انتظام کر دیا جائے، ہمیں کسی لمبی چوڑی تیاری کی ضرورت نہیں صرف خان دان کے چند معززین کو بلا لیا جائے، انھیں رخصت کرنے کے بعد ہم آپ کو اپنے ساتھ ادھونی لے جائیں گے۔

ایک کم سن لڑکا دوسرے کمرے سے نکلا اور سید حامد مراد علی کے قریب آ کر بولا، آپ کا نام مراد علی ہے۔

ہاں میرا نام مراد علی ہے۔اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

ہاشم بیگ نے کہا یہ آپ کا بھتیجا ہے۔

کم سن لڑکے نے کہا بھتیجا نہیں بھانجا ہوں، کیوں جی آپ میرے ماموں ہیں نا۔

ہاں لیکن تمہین کس نے بتایا۔

مجھے خالہ ثمینہ نے بتایا ہے

تنویر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بلاتے ہوئے کہا۔ یہ تمہارے خالو ہیں بیٹا۔

لڑکا مراد علی کو ایک ثانیہ بغور دیکھنے کے بعد بھاگ کر دوسرے کمرے میں ثمینہ کے پاس پہنچا اور بلند آواز میں بولا خالہ جان امی کہتی ہیں وہ میرے ماموں نہیں خالو ہیں۔۔۔ اور ثمینہ نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

تین دن بعد مراد علی اور ثمینہ کی شادی ہو چکی تھی۔



دو ماہ بعد مراد اور ثمینہ پہاڑی کے دامن میں بل کھاتی ہوئی ایک سڑک پر گھوڑے روک کر نیچے وادی میں بہتے ہوئے دریا کا دل کش منظر دیکھ رہے تھے۔ منور خان کے علاوہ پانچ اور نوکران سے چند قدم آگے سڑک کے ایک موڑ پر سامان سے لدے ہوئے چار اونٹوں کے پاس کھڑے تھے۔ کابل کا رخ کرنے والے تاجروں کا ایک قافلہ جس کے ساتھ انہوں نے پشاور سے آگے چند منازل طے کی تھیں۔کوئی دو میل پیچھے ایک گھاٹی سے گزر رہا تھا۔

مراد علی نے ایک بستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ثمینہ وہ سردار مکرم خاں

کی بستی ہے۔اور وہ ہماری آخری منزل ہے۔اور دریا کے دوسرے کنارے ان سنگلاخ چٹانوں کے پیچھے تمھارے قبیلے کے لوگ آباد ہیں۔ہم کسی دن ان کے پاس جائیں گے۔یہ وہ زمین ہے۔جس نے محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی کا جاہ جلال دیکھا تھا۔یہ وہ مقدس خاک ہے جس کے ذرے ذرے پر مسلمانوں کی عظمت کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں۔ہندوستان میں ہمارے آزادی کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں۔اور تلوار ٹوٹ چکی ہے۔جو برسوں سے جنوب میں انگریزوں کی جارحیت کا سیلاب روکے ہوئے تھی۔ہمارے تمام حوصلے اور ولولے سلطان شہید کے ساتھ سرنگاپٹم کی خاک میں دفن ہو چکے ہیں۔اب ہندوستان کا کوئی قلعہ کوئی دریا، یا پہاڑ فرنگی جارحیت کے سیلاب کو نہیں روک سکے گا۔افغانستان کے موجودہ حالات بھی کافی حوصلہ شکن ہیں۔لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ سنگلاخ چٹانیں اس سیلاب کے سامنے آخری دیوار ثابت ہونگی۔مین یہاں کے امراء کی خانہ جنگیوں سے متاثر نہیں ہوں۔مجھے ان کسانوں اور چرواہوں کی ہمت پر بھروسہ ہے۔جو خطرے کے وقت اپنے جھونپڑوں کو اسلام کے ناقابل تسخیر قلعوں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔مین اس ملک میں یہ امید لے کر آیا ہوں کہ کسی دن ہندوستان میں میرے مظلوم بھائیوں اور بہنوں کی فریاد ان لوگوں کو بے چین کردے گی۔ان پہاڑوں سے کوئی محمود نمودار ہوگا اور سلطان شہید کی روح دریائے کاویری کے کنارے اس کا استقبال کرے گی۔اس دن کوئی احمد شاہ ابدالی اٹھے گا اور ہندوستان کے مسلمان اپنے ظلمت کدوں میں ایک نئی صبح کے آفتاب کی روشنی دیکھیں گے۔پھر اگر ہم نہ ہونگے تو ہماری اگلی نسلیں یہاں سے جنوب اور مشرق کا رخ کرنے والے مجاہدین کے ہم رکاب ہوں گی۔

ثمینہ اس ملک کے غیور اور بہادر انسانوں کے دلوں میں ہمیں اسلام کی وہ

تڑپ اور ولولہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جو محمود غزنوی کو سومنات اور احمد شاہ ابدالی کو پانی پت کے میدان میں لے گیا تھا۔ مکرم خاں سے ملاقات کے بعد میں یہ احساس لے کر گیا تھا۔ کہ اگر افغانستان میں کوئی خدا کا بندہ اسلام کی صحیح روح بیدار کر سکا، تو یہ سرزمین اسلام کا ایک نا قابل تسخیر قلعہ ثابت ہو گی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں میں نے اپنے مستقبل کے متعلق جو خواب دیکھے ہیں۔ وہ کس حد تک پورے ہوں گے۔ لیکن میں تم سے ایک وعدہ کر سکتا ہوں کہ اب ہمارے مقدر میں انگریزوں کی غلامی نہیں ہو گی۔

چند منٹ بعد وہ اپنے حال اور مستقبل کے متعلق باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ اور ان کے تھکے ہوئے گھوڑے آہستہ آہستہ وادی کی طرف اترنے لگے، اگلے موڑ پر منور اور دوسرے آدمی ان کے ساتھ آ ملے۔ عصر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دریائے کابل کے کنارے پہنچ گئے۔ مراد علی گھوڑے سے اترا اور وضو کے لیے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے دریائے کاویری کے دل کش مناظر آ گئے۔ وہ تصور کے عالم میں سرنگا پٹم کے قلعے کی فصیلیں اور برج دیکھ رہا تھا، وہ شہر کی پر رونق گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ اپنے بچپن اور جوانی کے ساتھیوں کے ہمراہ سرنگا پٹم کے خوب صورت باغات کی سیر کر رہا تھا۔ وہ ان دل کش مساجد کا طواف کر رہا تھا۔ جہاں کبھی ہر نماز کے بعد سلطان ٹیپو کی فتح کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔۔۔ پھر یکے بعد دیگرے اس کے سامنے اپنے گھر کی مختلف تصویریں آنے لگیں۔ زندگی کی کتنی مسرتیں تھیں جو وہاں دفن ہو چکی تھیں۔ کتنے قہقہے تھے، جو گم ہو گئے تھے۔ جب کافی دیر ہو گئی تو ثمینہ نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ مراد نے مڑ کر دیکھا اور اس کی چھلکتی

ہوئی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

کیا ہوا ثمینہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا آپ رو رہے ہیں؟

کچھ نہیں ثمینہ یہ آنسو دریائے کاویری سے دریائے کابل تک پہنچنے والے مسافر کی زندگی کی آخری متاع ہیں۔۔

ختم شد ۔۔۔۔ THE END

